تبسم
رام لعل نابھوی
طنزیہ مزاحیہ
خاکے
تیسرا ایڈیشن

تبسم
رام لعل نابھوی
تیسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ

1. TABASSUM

2. Author

Rs. 25/- 3rd Edition

Ramlal

Nabhvi

Dewan Street

Nabha (Pb)

رام لعل نابھوی

تیسرا ایڈیشن مع مزید اضافہ

مصنف : رام لعل نابھوی، محلہ دیوان، نابھا ۔ ۱۴۷۲۰۱ پنجاب (انڈیا)
قیمت : پچیس روپے
کتابت : جمال گیاوی

بارِ اوّل : نومبر ۱۹۷۹ء
بارِ دوئم : اپریل ۱۹۸۳ء
بارِ سوئم : جنوری ۱۹۸۶ء

تقسیم کار :
انجمن ترقیِ اُردو ہند، اُردو گھر، راؤز ایونیو نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ناشر :
رام لعل نابھوی، محلہ دیوان، نابھا ۱۴۷۲۰۱
پنجاب (انڈیا)

(جمال پریس - دہلی)

تبسّم
رام لعل نابھوی

ترتیب

عَرضِ مُصنّف

تبسّم طنزیہ، مزاحیہ خاکوں پر مشتمل میری پہلی تصنیف ہے۔ پہلا ایڈیشن نومبر ۱۹۷۹ء میں اور دوسرا ایڈیشن اضافہ کے ساتھ اپریل ۱۹۸۳ء میں شایع ہوا ۔ یہ تیسرا ایڈیشن معہ مزید اضافہ ہے۔

اس کتاب پر آندھرا پردیش اُردو اکادمی ، ہریانہ ساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ مرحمت فرمائے۔

سرکارِ ہند کی تین وزارتوں خارجہ ، دفاع اور تعلیم نے جلدیں خریدیں۔ مہاراشٹر اُردو اکادمی ، پنجاب اور ہریانہ سرکاروں نے جلدیں خریدیں۔

پنجاب، ہریانہ ، ہماچل سرکاروں نے اپنی لائبریریوں کے لیے یہ کتاب منظور کی۔

میری اَدبی خدمات کے پیشِ نظر بہار اُردو اکادمی نے دو ہزار روپیہ کا گراں قدر انعام دیا۔

قطعۂ تاریخ اشاعت "تبسم"

مصنف : رام لعل نابھوی

نوشتہ نابھوی صاحب کتابے | شگفتہ سر بسر باغِ لطافت
نہادہ نامش دلکش "تبسم" | بشد شاداب بستانِ ظرافت
مزاح و طنز و طعنہ و تمسخر | بیانش در حدِ تہذیب و فطنت
بہ ناز و فنِ انشا بر وجودش | ز ہر تحریر ظاہر است جودت
ادب پرور، ادب گستر، ادب جو | تراود می ز ہر لفظے حلاوت
بظاہر سادگی مترشح گردد | بباطن است پنہاں گنج عبرت
دماغش را خدا بخشیدہ پرواز | قلم را داد اعجاز و کرامت
عیاں باشد بہ ہر سو خوش مزاجی | زبانش را میسر شد عذوبت
زہے ایں سہل گوئی، سہل جوئی | بہ ہر حرفے بود قرباں سلاست
منقش گشت در دل ہر بیانش | تعالی اللہ تاثیر و نزاکت

رتن ہاتف بگوید بہر تاریخ
کمالِ موجِ گلزارِ ظرافت

۱۹۷۹ عیسوی

پنڈت رتن پنڈوروی

پیش لفظ

خندۂ دندان نما اور تبسّم زیرِ لب میں بڑا فرق ہے۔ یہی فرق مسخرے کی اُچھل کود اور مزاح نگار کی بذلہ سنجی میں بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مسخرہ کوئی ایسا فقرہ لڑھکاتا یا کوئی ایسی مضحکہ خیز حرکت کرتا ہے کہ آپ بلا سوچے سمجھے ہنسنے لگتے ہیں۔ مگر ایک مزاح نگار پہلے آپ کی سوچ کو متحرک کرتا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ سوچ کے لیے غذا مہیّا کرتا ہے اور پھر جب ناہمواری آپ پر پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے تو آپ مسکرانے لگتے ہیں۔ گویا ساری بات فنّی بُعد کی ہے۔ غزل کے ایک شعر کے دونوں مصرعوں میں اگر زینے کی سی بات پیدا نہ ہو یعنی زینے کا ایک قدم (STEP) دوسرے قدم کی نسبت زیادہ بلندی پر نہ ہو تو فنّی بُعد وجود ہی میں نہیں آئے گا۔ زینے کے ایک قدم پر سے پاؤں اُٹھا کر دوسرے اور بلند تر قدم پر رکھنے میں جو فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے وہی تو جمالیاتی حظ کی تحصیل کا اصل محرّک ہے اسی طرح مزاح نگاری اگر فنّی بُعد کو وجود میں نہ لا سکے تو مسخرہ پن ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ ہنسی کے معاملے میں پاؤں کا رُخ اوپر والے قدم

(STEP) سے نیچے والے قدم کی طرف ہوتا ہے) بلکہ بات شاید اس سے بھی کچھ آگے ہے۔ وہ یوں کہ اگر کوئی تخلیق فن کے معیار پر پوری نہ اُترے تو زیادہ سے زیادہ ناقص قرار پائے گی جب کہ مزاحیہ تخلیق اگر ہنسی کو تحریک نہ دے سکے تو مضحکہ خیز نظر آئے گی۔ لہٰذا مزاح نگاری پُل صراط پر سے گزرنے کا عمل ہے اور پُل صراط کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔

رام لعل نابھوی کے مزاحیہ مضامین جب میرے سامنے آئے تو مجھے محسوس ہوا کہ قدرت نے ان سے انتقام لینے کی یہ صورت پیدا کی ہے کہ انھیں مزاح کے پُل صراط پر سے گزرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوا کہ رام لعل نابھوی اس پُل پر سے بخیر و خوبی گزر گئے ہیں۔ درمیان میں وہ چند ایک مقامات پر ڈانواڈول سے ہوئے اور ایک آدھ جگہ لڑکھڑائے بھی مگر وہ گرے نہیں اور مزاح کی مملکت میں تلوار کی دھار پر سے خود کو گرنے نہ دینا کوئی معمولی بات نہیں۔

یوں تو رام لعل نابھوی کے ہر مضمون میں کوئی نہ کوئی ایسا پیراگراف ضرور آگیا ہے جس نے پہلے سوچ کو مہمیز لگائی ہے اور پھر ہنسی کو تحریک دی ہے۔ تاہم میں بطور خاص ان کے مضامین 'لفافہ'، 'مہمان'، 'اعداد سے ملاقات'، اور 'ملاقات'، سے محظوظ ہوا ہوں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان چاروں میں سے تین مضامین مکالمے کی صورت میں ہیں۔ گویا تمثیلی انداز اور ڈرامائی صورتِ حال پیدا کرنے میں رام لعل نابھوی صاحب کو ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ مکالمے کی برجستگی، خیال کی ندرت اور ایک مضحکہ خیز صورتِ حال کی پیش کش۔ ان سب میں ایک فطری نفاست اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً 'لفافہ' میں کرداروں ہی نے اپنی ناہمواریوں کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ایک ایسی مانوس نفسی کیفیت بھی اجاگر ہوئی ہے جس میں سے ہم آپ سب ہر روز گزرتے ہیں۔ مگر ہمیں اپنے عمل کی مضحکہ خیزی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ 'مہمان' میں زیادہ زور کردار کی ناہمواری کو اجاگر کرنے کے بجائے صورتِ حال کی ناہمواری کو نمایاں کرنے پر ہے جب کہ 'ملاقات' میں کردار کی

ناہمواری نے ہنسی کو تحریک دینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ رام لعل نابھوی کا ایک اہم مضمون "اعداد سے ملاقات" ہے۔ اس میں مزاح ایک زیریں لہر کی طرح مزاح نگار کی سوچ کی کروٹوں میں رواں دواں دکھائی دیتا ہے۔ یہ مضمون خاصے کی چیز ہے۔

اب میں زیادہ دیر تک رام لعل نابھوی اور اس کے قارئین کے درمیان حائل رہنا نہیں چاہتا۔ کتاب کا دیباچہ اُنھوں نے خود ہی تحریر کر دیا ہے اور اس کے جواز میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ ... "اس کتاب کا دیباچہ اس لیے لکھا گیا ہے کیونکہ ہر کتاب کا ایک دیباچہ ہوتا ہے۔" ایسے بھرپور دیباچے کے بعد اب "پیش لفظ" کا کیا جواز ہو سکتا ہے! تاہم میں نے بھی پیش لفظ کے طور پر یہ چند سطریں محض اس لیے لکھ دی ہیں کہ جہاں ہر کتاب کا ایک دیباچہ ہوتا ہے وہاں ایک عدد پیش لفظ بھی ہوتا ہے۔ یا شاید نہیں ہوتا۔ کون جانے !!

—— وزیر آغا

یکم مارچ ۱۹۷۹ء

اُردو ادب میں طنز و مزاح

طنز و مزاح کی صفت میں طنز، مزاح، تبسّم، ہنسی، قہقہہ، پیروڈی، تحریف، رمز، ہجو، پھبتی، تنقیص، تضحیک، تمسخر، استہزا، خمریات، ہزل، پھکڑپن، فحاشی، ریختی، لطیفہ، ضلع جگت، نعرہ آتے ہیں۔

طنز: سماج یا انسان کے کسی رِستے ہوئے زخم کا تاثر۔ کسی واقعہ یا ماحول سے برہمی اور نفرت، طنز نگار کو اکساتی ہے کہ وہ تہذیب اور ادب کے دائرے میں رہتے ہوئے طنز کا ایک ایسا نشتر چبھوئے اور اس طرح کہ فاسد مادّہ نکل جائے۔ اور طنز کی تلخی ہوتے ہوئے اسے بھی لطف دے جائے جس پر طنز کیا گیا ہو۔

مزاح: اور اس کے مظاہر ہیں تبسم، ہنسی، قہقہہ، سوسائٹی

کے مروّجہ قواعد اور ضوابط سے انحراف، فرد کی خامیوں، زندگی کی ناہمواریوں اور تضادات کو فن کار اس طرح کر دیتا ہے کہ اس سے مسرّت، شگفتگی اور لطافت میسّر آتی ہے اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

پیروڈی: کسی کلام یا تخلیق کے الفاظ اور مصنّف کے خیالات کو اس طرح بدل دیا جائے کہ مزاح اور تنقید پیدا ہو جائے۔ اس میں ہجو، ہزل، تضحیک، تنقیص وغیرہ کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔

تحریف: کسی نثر پارہ یا شعر میں ایک آدھ یا چند الفاظ کا الٹ پھیر ردّو بدل یا کمی بیشی تحریف ہے۔ نیّت اصل مصنف کی بات کو غلط طریقے پر پیش کرنے کی ہوتی ہے۔

رمز: دلائل، نظریات اور طریق استدلال کو بظاہر تسلیم کر کے اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کے کمزور پہلو نمایاں ہو جائیں۔

ہجو: اور اس کے مظاہر ہیں پھبتی، تنقیص، تضحیک، تمسخر، استہزاء، خمریات، جس شخص کی ہجو کی جاتی ہے یا اس پر فقرہ چست کیا جاتا ہے یا تمسخر اُڑایا جاتا ہے۔ غرض اس کی تحقیر کرنا مقصود ہوتا ہے۔

ہزل: اس کے مظاہر پھکڑپن، فحاشی اور ریختی ہیں۔ کلام کا مذاقِ سلیم سے گر جانا مگر تہذیب کا دامن تھامے رہنا، ہزل کی خصوصیت ہے۔

لطیفہ: اور اس کا مظہر ضلع جگت ہے۔ واقعہ دلچسپ ہو اور اس میں بیان کی ندرت ہونا ضروری ہے۔

نغز: برمحل فقرہ چست کرنا یا برجستہ حاضر جوابی جس سے ہنسی اُڑانے کے قابل نکتہ نکال لیا جائے، نغز کے تحت آتا ہے۔

زندگی کی یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان دُنیا میں جیتا چلا آتا ہے۔ اور جیتا چلا تا دُنیا سے جاتا ہے۔ یعنی وہ دُنیا میں آنا نہیں چاہتا اور آنے کے بعد

جانا نہیں چاہتا حالانکہ اسے نہ دُنیا میں آنے کے وقت کا پتہ ہوتا ہے اور نہ جانے کا پتہ لگتا ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد اگر بچہ نہ چلّائے تو اسے اُلٹا لٹکا دیا جاتا ہے۔ تھپڑ پڑتے ہیں اور اسے چیخنے چلّانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ رونا سب کو آتا ہے مگر ہنسنا سب کو نہیں آتا۔ انسان ہنستا بھی کیسے جب اس کے باوا آدم کو حوّا کے ساتھ خدا نے ناراض ہو کر اپنے گھر سے ہی نکال دیا اور پھر خود جس کا سب سے بڑا کارنامہ انسان کی تخلیق ہے، خود کہاں ہنستا ہے۔ کوئی آسمانی صحیفہ اُٹھا کر دیکھ لیجیے۔ خدا کے ہنسنے کا کوئی ذکر نہیں ملے گا۔

لگتا ہے جب انسان نے ترقی کی منزلیں طے کیں اور کائنات کے وحشی عناصر کو قابو میں کیا تو ہنسنے کا عمل وجود میں آیا۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ دُنیا کی جملہ ذی رُوح مخلوق میں صرف انسان ہی ایک ہنسنے والا جانور ہے۔

زندگی محض درد و غم ہے، رنج و الم ہے۔ ناموزوں، نامکمل، غیر متناسب لیکن انسان فطری طور پر مسرت کا طالب ہے۔ چونکہ زندگی میں خوشیاں کم ہیں اس وجہ سے بھی مسرت کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔ ہنسی غم غلط کرنے کا ہی دوسرا نام ہے۔ خوشی حاصل کرنے کے لیے انسان زندگی کی تلخیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔

ادب کا مقصد ہی خوشی پیدا کرنا ہے۔ تہذیبی اور ادبی ارتقا کے ساتھ تقریر و تحریر، حرف و صوت کا سہارا لیا گیا۔ ناٹکوں اور ڈراموں میں بدوشک رنگ بھرتے رہے۔ سرکس مسخروں نے کامیاب کیے۔ درباروں میں بذلہ سنج، ظریف، بھاٹ، نقال، اور تمسخر نواز رنگینیاں لائے۔ شعر و ادب، رقص و موسیقی، نغمے اور گیت، بارش کی پھوار، رندی و سرمستی، بسنت اور بہار، آبشاروں، جھرنوں کی سُریلی آواز، مور کا ناچ، پپیہے کی پی ہو پی ہو، ہرنوں کی چوکڑیاں، کھِلتے پھول، چٹکتی کلیاں، مصوری، نقاشی اور سنگ تراشی کے ذریعہ زندگی کو زندگی ملی۔ اور انسان مسکرانے لگا۔ ہنسنے لگا، قہقہے لگانے لگا۔

ہندوستان میں طنز و مزاح پرانے وقتوں سے چلا آرہا ہے۔ یہاں شرنگار رس، ویر رس، کرونا رس، ہاسیہ رس تھا۔ ویدوں میں طنز کی لہریں ملتی ہیں۔ ناٹیہ شاستر میں طنز و مزاح کے جوہر ہیں۔ سنسکرت کا کوئی ڈرامہ بدوشک کے بغیر نہیں ملے گا۔ یہ بدوشک اونچے کُل کا ہوتا تھا۔ سُلجھا ہوا انسان ہوتا تھا۔ اونچے کُل کا اس لیے کہ اگر کوئی نازیبا حرکت ہو جائے تو بادشاہِ وقت اسے درگزر کردے اور سلجھا ہوا اس لیے کہ وہ نازیبا حرکت ہی نہ کرے۔ سدھ ساہتیہ میں پوجا پاٹھ کرنے والے پنڈتوں پر طنز کے تیر چلائے گئے ہیں۔ تلسی کی کرشن گیتاولی میں طنز ہے۔ گوپیوں نے اودھو کی گیان کی تعلیم کا کھُل کر مذاق اُڑایا ہے۔ کبیر نے پنڈتوں پر طنز کیا ہے۔

یونان میں طنز و مزاح نکھرا۔ لاطینی میں ہوریس نے اور ہولیس کی طرز پر اطالوی شاعر لونڈوو کو اریسٹو نے طنز و مزاح لکھا۔

انگلستان میں طنز و مزاح ارتقا کی منزلوں سے ہوتا ہوا ایسے دور میں پہنچا، جہاں آسکر وائلڈ، چیسٹرٹن، برنارڈ شاہ جیسے جید ادبا نے اسے چار چاند لگا دیے۔

عرب میں جحی اور اشرف عربوں کے ظریف تھے۔ ملا نصیر الدین ترکوں کا سب سے بڑا ظریف تھا۔ شیخ زاہد، واعظ اور محتسب کی تضحیک فارسی ادب کا کارنامہ ہے۔

طنز و مزاح کی روایت طویل ہے۔ مختصر یوں، کہ اردو ادب نے سنسکرت، عربی اور فارسی زبانوں کی روایتوں کو اپنایا ہے۔

طنز و مزاح بے معنی ہنسی کا نام نہیں۔ اس کے لیے اسالیبِ بیان سے پوری واقفیت اور اظہارِ خیالات پر کامل قدرت ہونا لازم ہے۔ طنز و مزاح گہرے عرفانِ ذات یا معاشرہ کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ مشاہدہ، مطالعہ اور مشق لازم ہے۔ طنز و مزاح نگار کو اپنے عہد، ماحول میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات کا علم ہونا ضروری ہے۔ وہ ہر وقت باخبر رہتا ہے اور ہر آن وقوع پذیر ہونے والے حادثات و واقعات کو موضوعِ سخن بناتا ہے۔ کیونکہ طنز و مزاح وقت کے ساز پر رقص کرتا ہے۔ اس صنف کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لیے بڑی دانشمندی اور

ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان کی چاشنی، فقروں کی لطافت، الفاظ کی مخصوص حسین و دلکش ترتیب و تنظیم، جملوں کی شناخت، امیجز کا استعمال، ماحول کی تصویر کشی تخلیقی رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ الفاظ گونجتے، گرجتے، برستے، ناچتے اور وجد کرتے نظر آتے ہیں۔ عربی کی ایک مثل مشہور ہے: ”المزح فی الکلام کالملح فی الطعام“ یعنی کلام کو خوش گوار بنانے میں مزاح کو وہی دخل ہے جو نمک کو کھانے کے لذیذ بنانے میں۔ طنز و مزاح تضادات، قول و فعل ظاہر اور باطن کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ طنز و مزاح نگار دوسروں کو نشانۂ ملامت بناتے ہیں۔ اپنی ذات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس سے بظاہر خود کی تضحیک ہوتی ہے لیکن ان کا اثر بُرا نہیں پڑتا بلکہ سننے اور پڑھنے والے کی نظر میں توقیر بڑھتی ہے۔ طنز و مزاح میں اعتدال کی ذرا سی لغزش پھکڑپن اور پست مذاق میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لغزش طنز و مزاح نگار کو عمر بھر منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ طنز نگار کے تیر نیم کش کی خلش کا مزہ دیتے ہیں۔ وہ مریض کا نہیں مرض کا دشمن ہوتا ہے۔ اس کے لہجے میں سچائی کی تلخی کے ساتھ پیار کی مٹھاس بھی ہوتی ہے۔ طنز مزاح سے بیگانہ نہیں ہوتا ———
فارغ البالی، عیش و عشرت کے دور میں مزاح پنپتا ہے اور تخریب اور یہی میں طنز کے عناصر اُبھرتے ہیں۔ جو شخص فطرتاً ظریف زندہ دل اور شگفتہ طبع ہوگا اتنی ہی اس کی تحریر میں لطافت اور دلکشی ہو گی۔

ہر عہد میں طنز و مزاح کے ادبی پیکر اور سانچے بدلے۔ ہجو، پھبتی، تنقیص، تضحیک، تمسخر، استہزا، خمریات، ہزل، پھکڑپن، محاشی، ریختی کا دور قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔

مجذوبوں، مفکروں، فلسفیوں، عارفوں کو آپ نے دیکھا ہی ہے۔ یہ خدا کے بندے، خدائی کے ٹھیکیدار، جنت کے علم بردار، ہر وقت رنجیدہ، غم دیدہ، سنجیدہ فکر میں ڈوبے، سر جھکائے، سوچ میں غرق نظر آئیں گے۔ مسکراہٹ ان کے پاس

پھٹکتی تک نہیں۔ اوّل تو کسی سے بات ہی نہیں کرتے۔ کریں گے، تو اتنی دھیمی آواز سے کہ مخاطب کے پلے ہی کچھ نہیں پڑتا۔ بات بات پر جھڑکنا ان کا اصول۔ لوگ خدا سے اتنا نہیں ڈرتے تھے، جتنا ان سے۔ ڈر کے مارے ان کی پرستش پہلے ہوتی تھی۔ خدا کی بعد میں۔

سادھوؤں، صوفیوں، فقیروں، بھکشوؤں، پجاریوں نے جال پھیلایا چلّے ہوتے، دھونیاں رمائی جاتیں۔ فاقے کاٹے جاتے۔ جو مل گیا، کھالیا۔ نہ ملا، نہ سہی —— کام کرنا حرام۔ زندگی سے بیزاری۔ آرام اور فقط آرام یا پھر خود ساختہ مصیبت۔ خود زندگی کو المیہ سمجھتے اور دوسروں کو یہی بتاتے۔ ان کا دَور بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔

اُردو ادب طنز و مزاح مغلوں کے زوال کے دَور میں پیدا ہوا۔ شروع شروع میں اس صنف کو وہ مقام نہ مل سکا۔ لیکن جوں جوں نگارشات اور تخلیقات میں رنگ بھرتا گیا، یہ فن سنجیدہ ادب سے بھی آگے نکل گیا۔ غدر نے ایک طاقتور سلطنت کو ختم کیا۔ مغربی تہذیب کی اندھا دھند پیروی شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی شعراء اور ادباء نے طنز کے تیکھے تیر چھوڑے، ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑیں اور دُنیائے ادب میں ایک طوفان بپا کر دیا۔ پھر ملک تقسیم ہوا، اندوہ ناک حالات پیدا ہوئے۔ اغوا، زنا، قتل و غارت، سراسیمگی اس پیمانے پر ہوئی کہ ملک تباہ و برباد ہو گیا۔ وہ شاعر اور افسانہ نگار جو سنجیدہ ادب کی دُنیا کے شہسوار تھے، گھائل ہو کر طنز کے تیر اور تفنگ لے کر میدان میں کود ے۔ اُردو زبان کا المیہ آیا۔ وہ زبان جو ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ پلی اور بڑھی اور مدتوں خوشیاں بکھرتی رہی، اپنے ہی گھر میں بیگانہ بن رہی تھی۔ طنز و مزاح کا سیلاب پھر اُمنڈا۔ اب اُردو زبان نے پھر سے اپنے پاؤں جمانے شروع کر دیے ہیں۔

اُردو ادب میں سب سے پہلی رَو ہجویات کی ہے۔ یہ صنف فارسی زبان سے مستعار ہے۔ واعظ، زاہد، محتسب، شیخ کی تضحیک کی گئی۔ اس کی داڑھی کی پھبتی اُڑائی گئی۔ اس کی ریاکاری کا پول کھولا گیا۔ ظاہر و باطن کا فرق دکھایا گیا۔ حافظ نے لکھا:

چو طفلاں تا کہ اے واعظ فریبی
بہ سیبِ بوستاں و جوئے شیرم

یہی اثرات ایرانیوں کے ذریعے ہندوستان پہنچے۔ اُردو شاعری کی بحریں اوزان، استعارے، تشبیہات، محاورے، تلمیحات سب فارسی شاعری سے لیے گئے۔ واعظ اور زاہد کا تمسخر بڑھتے بڑھتے کعبہ و بتخانہ، تسبیح و زنار، مسجد و مے کدہ کو بھی لپیٹ میں لے گیا۔ عمر خیام، شیخ سعدی، خسرو اور ولی سے لے کر اقبال تک نہایت لطیف چوٹیں ہوئی ہیں۔ کچھ نمونے دیکھیے:

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

—— اکبر الہ آبادی

کیا شیخ کی تلخ زندگانی گزری
بیچارے کی اک شب نہ سہانی گزری
دوزخ کے تخیل میں بڑھاپا گزرا
جنت کی دعاؤں میں جوانی گزری

—— جوش ملیح آبادی

پی لو گے اگر شیخ تو کچھ گرم رہو گے
ٹھنڈا ہی نہ کر دیں کہیں جنت کی ہوائیں

—— جوش ملسیانی

ہجویات کا پہلا شاعر جعفر زٹلی تھا۔ اس کی بے باکی یہ عالم تھا کہ فرخ سیر نے اسے قتل کروا دیا تھا۔ اٹھارویں صدی میں طنز و مزاح کی روایت کے سالار اعظم مرزا سودا تھے۔ سودا کی ہر بات میں شوخی، گدگدی، چشمک ہوتی۔ ہجو میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ لوگ اُن سے خائف رہتے۔ ذرا ناراض ہوئے اور ہجو کا طومار باندھ دیا۔ میر ضاحک، فدوی، مسکین اور بقا سے ان کی چشمک رہی۔ شیدی نولاد خاں، مرزا فاخر مکیں، میر ضاحک اور بقا کی ہجویں لکھیں۔ بقاء اللہ بقا نے میر و مرزا کی ہجویں لکھیں۔ انشاؔ اور مصحفی نے ایک دوسرے کی ہجویں لکھیں۔ مغل سلطنت روبہ زوال تھی۔ لیکن یہ لوگ سب باتوں سے بے نیاز ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے رہے۔ کیچڑ اُچھالتے رہے۔ سودا کا ایک بند میر ضاحک کی ہجو میں دیکھیے:

لایا غضب میں شیخ کو گھر کا یہ بند و بست
مشکیں تڑا پہنچ گئے جورو سے کر کے جست
بال اس کے ان کے ہاتھ پر ریش ان کی اس کے دست
عہدے سے بر نہ آئے تھے از بس ضعیف و پست

پاپوش تب سے جورو کی کھاتے ہیں شیخ جی!

شاعروں کی چشمکیں اور معرکے چلنے لگے۔ شاہ مبارک اور مرزا مظہر، سودا اور ضاحک، میر اور خاکسار، سودا اور فدوی، میر اور بقا، مصحفی اور انشاء، ناسخ اور آتش، ذوق اور غالب، انیس اور دبیر کے معرکے اردو ادب میں بیش بہا سرمایہ ہیں لیکن کچھ معرکے حد سے تجاوز کر گئے اور بدنماد ھبے بن گئے۔

ایرانی اور عربی شاعری میں فحش گوئی اور ہجو گوئی عام تھی۔ ہجو نگاروں کی فہرست طویل ہے۔ ہجو کا رجحان اب ختم ہے۔

ریختی اسی دور کی ایجاد ہے۔ اس کے موجد سعادت یار خاں رنگیں تھے۔

انشاء نے بھی حصہ لیا۔ ریختی عورتوں کی زبان ہونے کی وجہ سے عیاشوں کو پسند تھی۔ محض فحش اور مبتذل باتیں ہوتی تھیں۔ ریختی میں جان صاحب، نظیر اکبرآبادی، نازنیں، عنقا بیگم، عصمت، غالب اور اکبر الہ آبادی کا کلام بھی ملتا ہے۔ نمونہ دیکھیے:

کل جو میں نے کہا زناخی سے
جی میں آتا ہے تجھ سے کیجیے عیش
تو لگی کہنے یوں وہ اے رنگیں
بس بس اب مجھ کو مت دلاؤ طیش

—— سعادت یار خاں رنگیں

ریختی کا دور بھی ختم ہوا۔

ہزل گوئی میں میر زٹلی نارنولی، نامی، چرکین، فسق، میر غلام حسین برہانپوری انوق نے نکر کیا ہے۔ یہ روایت عریاں دہلوی اور رفیق احمد لکھنوی تک آتی ہے۔ ہزل کے رجحانات بھی ختم ہو چکے ہیں۔

سودا کے بعد نظیر اکبرآبادی ہر رنگ میں پورے آب و تاب سے نظر آتے ہیں۔ وہ بات سیدھی اور صاف پیرایہ میں اس طرح کہتے تھے کہ دلوں میں اتر جاتی تھی۔ بہتوں کو کلام ازبر تھا اور وہ چٹخارے لے کر سنتے سناتے تھے۔ نمونہ کلام دیکھیے:

پھر پوچھا میں نے کہیے یہ ہے دل کا نور کیا
اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سُن کے تیرا گیا ہے شعور کیا
کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

غالب کی کامیابی کا راز اسلوبِ مزاح اور طرزِ بیان میں چھپا ہوا ہے . . .

لکھتے ہیں :

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

نثر میں طنز و مزاح کی داغ بیل سب سے پہلے غالب نے ڈالی۔ سخت کوشی کے عالم میں بھی ظرافت اور لطافت کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ نمونہ دیکھیے :

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ ۶۵ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی ہے۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ۔ مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی نہ بنو۔ میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ۔ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی، منّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی۔ ایک قصر ملا، ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے۔ اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اسی تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی۔ وہی زمردین کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور۔ وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ۔ کہیں اور دل لگاؤ۔"

غالب کے بعد ایک زمانہ تک طنز و مزاح کا فقدان رہا۔ غدر نے سب کچھ تباہ کر ڈالا تھا۔

اب ہم اس عہد میں داخل ہوتے ہیں جسے اودھ پنچ کا دور کہا جاتا ہے۔ منشی سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، محمد آزاد، عبدالغفور شہباز، جوالا پرشاد برق، اکبر الہ آبادی، احمد علی کسمنڈوی، ظریف لکھنوی وہ نام ہیں جو دُنیائے ظرافت میں ستاروں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ اور رہتی دُنیا تک جگمگاتے رہیں گے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جو ظرافت کے اس بے پناہ منبع سے محفوظ رہا ہو۔ مغربیت مشرقیت کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ نظم و نثر دونوں میں ظرافت کے گل بوٹے کھلائے گئے۔ سرشار کا فسانہ آزاد لافانی شاہکار ہے۔ اردو شاعری میں پیروڈی کا رواج دینے والے رتن ناتھ سرشار، اکبر الہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر اور مہ لانا جنوبی تھے۔ سرشار کی پیروڈی کا ایک نمونہ دیکھیے:

پلا ساقیا مالوے کی نسیم
کہ کر آؤں گلگشت باغ نعیم
نہ مطرب نہ ساغر نہ مینا نہ چنگ
نہ چانڈو نہ افیوں نہ گانجا نہ بھنگ
کرم کر فقیروں پہ مائی ڈئیر!
میں قربان جاؤں ذرا کم ہیئر

اکبر کے کلام کا نمونہ دیکھیے:

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا!

اس پرچے نے کارٹون کا رواج دیا۔ اس اخبار کی سینکڑوں نے نقالی کی۔ لیکن اس معیار پر کوئی نہ پہنچ سکا۔ کچھ مباحثے اور مضامین غیر معیاری تھے۔

۱۹۳۱ء میں 'سرپنچ' جاری ہوا۔ ظریف لکھنوی کا مزاحیہ کلام 'کلام ظریف'، 'مزاح ظریف'، 'ظرافتِ ظریف' اور 'فرمانِ ظریف' کے عنوانات سے شایع ہوا ہے۔ سرپنچ سالِ نو کے موقعہ پر سرپنچ گزٹ شایع کرتا تھا اور شعراء کو خطاب دیے جاتے تھے۔

مزاحیہ افسانے، ڈرامے، ناول شایع ہوئے۔ اخبارات اور رسائل جاری ہوئے۔ فکاہیہ کالموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کارٹون بنائے گئے۔ لاہور ادیبوں اور شاعروں کا اکھاڑہ تھا۔ یہاں پنجاب کے دریائے ظفر علی خاں کی ہولناک موجوں کے تھپیڑے تھے۔ یہاں ہری چند اختر بڑے بڑے جغادری شعراء کو اپنے ایک ہی شعر سے نشانہ بنا دیتے تھے۔ یہاں پطرس تھے، کنہیا لال کپور تھے، کرشن چندر تھے، فکر تونسوی، شفیق الرحمان، عبد المجید سالک، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج عبد العزیز فلک پیما وغیرہ تھے۔ اپنے نام اُچھالے جاتے۔ دوسروں کی پگڑیاں اُچھالی جاتیں۔ ریاض خیرآبادی، فرحت اللہ بیگ، عظیم بیگ چغتائی اور رشید احمد صدیقی طنز و مزاح نگاری کے ستون ہیں۔

پیروڈی میں اصل تخلیق کے الفاظ اور مصنف کے خیالات کو اس طرح بدل دیا جاتا ہے کہ مزاح اور تنقید پیدا ہو۔ پیروڈی نظم اور نثر دونوں کی کی جاتی ہے۔ پیروڈی مقبول نظم یا نثر کی ہی ہوتی ہے جو زبان زد عام ہو گئی ہے۔ پیروڈی نگار اصل تخلیق کو اس خوبی سے بدلتا ہے یا اس میں کمی بیشی کرتا ہے کہ نظریہ مصنف کا ہی رہتا ہے لیکن اندازِ بیان پیروڈی نگار کا اپنا ہوتا ہے۔ اس میں طنز، مزاح، کنایہ، اشاریہ، رمز جیسے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ پیروڈی ادبی تفریح بھی ہے اور ادبی تنقید بھی۔ پیروڈی کے لغوی معنی نقل خندہ انگیز ہیں۔

پیروڈی نگاروں کی فہرست طویل ہے۔ چراغ حسن حسرت، مجید لاہوری، محمد عاشق، کنہیا لال کپور، غلام احمد فرقت، گوپی ناتھ امن، ہری چند اختر، راجہ مہدی

علی خاں، شوکت تھانوی، محمد جعفری، ضمیر جعفری، خضر تمیمی، باچس لکھنوی، رئیس امروہی، دلاور فگار، حاجی لق لق وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ یہ فن بہت نازک ہے۔ فن کی رُوح تک پہنچے بغیر، پیروڈی بن ہی نہیں سکتی۔ ایک نمونہ دیکھیے: علامہ اقبال کی نظم مومن کی پیروڈی شوکت تھانوی نے کی ہے:

کمزور مقابل ہے تو فولاد ہے مومن
انگریز ہے سرکار تو اولاد ہے مومن
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت
اس قسم کی ہر قید سے آزاد ہے مومن
ہے جنگ کا میدان تو اک طفلِ دبستاں
کالج میں اگر ہے تو پری زاد ہے مومن

پیروڈی اور تحریف میں ذرا لطیف سا فرق ہے۔ تحریف کرنے والے کی نیت اصل مصنف کی بات کو غلط طریقے پر پیش کرنے کی ہوتی ہے جبکہ پیروڈی میں یہ کام تفریح کے لیے کیا جاتا ہے۔

لطیفہ کی ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہری چند اختر ریڈیو میں ملازم تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ کسی محترمہ نے ٹیلی فون کیا۔ پنڈت جی نے محترمہ سے کہا کہ متعلقہ صاحب کو وہ ان کا پیغام پہنچا دیں گے کیونکہ ابھی وہ موجود نہیں۔ محترمہ نے ٹیلی فون پر پوچھا۔۔ "آپ کا اسم گرامی"۔ آپ نے جواب دیا۔۔ "ہری چند اختر"۔ محترمہ نے کہا۔ "ہری چند" آپ نے فرمایا۔۔ "اختر"۔ محترمہ نے کہا: "سبحان اللہ، کیا نام ہے۔ ہری چند اختر۔ یہ تو وہی بات ہوئی ممتاز شانتی"۔

خلیفہ عبدالحکیم رقمطراز ہیں :

" میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک حکیم صاحب کبھی کبھی علامہ اقبال کے پاس آبیٹھتے تھے۔ وہ ذرا رندِ مشرب تھے۔ اربابِ نشاط کے کوٹھوں پر بھی نظر آتے تھے۔ اقبال نے ہنس کر پوچھا : " کہیے حکیم صاحب! آج کل اس حلقے میں کس کس کے پاس آنا جانا ہے "

حکیم صاحب بولے . . . " جی کہاں، اب تو بس یہیں آتا ہوں "

بقول ڈاکٹر وزیر آغا . . . " جدید اُردو ادب نے تین طنز نگار پیدا کیے ہیں۔ رشید احمد صدیقی، کرشن چندر اور کنھیّا لال کپور۔

عہدِ حاضر میں طنز و مزاح خوب لکھا جا رہا ہے۔

اِس کتاب کا دیباچہ محض اس لیے لکھا گیا ہے کیونکہ ہر کتاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ بغیر دیباچے کے کتاب کو کتاب ہی سمجھا نہیں جاتا۔

مضامین لکھنے والا بھلے ہی ادیب نہ ہو اور خود کو ادیب سمجھ کر مضامین لکھے۔ لیکن دیباچہ کسی مستند ادیب سے ہی لکھوانا پڑتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہر طرح کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ مختلف مراحل طے کیے جاتے ہیں۔ بار بار چکر لگائے جاتے ہیں۔ خوشامدیں کی جاتی ہیں۔ سفارشیں لائی ہی نہیں لڑائی جاتی ہیں۔ رشوتیں دی جاتی ہیں۔ نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔ قیمتیں چکائی جاتی ہیں۔ یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے۔ جب کوئی ادیب اپنے مضامین کو کتابی شکل دیتا ہے۔ اور اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک ادیب مضامین کو کتابی شکل دیتا رہتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت

ختم ہوتا ہے جب ادیب مضامین لکھنے کی بجائے دیباچے لکھنے کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے
یا محض دیباچوں پر مضامین لکھنا شروع کر دیتا ہے۔

دیباچہ لکھنے والوں کی بہت قسمیں ہیں۔ کچھ تو دیباچہ قطعاً نہیں لکھتے یا تو
اس لیے کہ وہ کسی ادیب کو اس قابل ہی نہیں پاتے کہ جو ان سے دیباچہ لکھوانے کا
حقدار ہو یا پھر اس لیے کہ ان کو فرصت نہیں ہوتی۔ آخر دیباچہ لکھنا مذاق تھوڑا ہی
ہے۔ ہر مضمون کے ہر لفظ کو عمیق نظر سے دیکھنا ہوتا ہے۔ طرزِ تحریر، بندش، محاوروں
کا صحیح استعمال، فکر و تخیل، منظر نگاری، اندازِ سب باتوں کی چھان بین کرنی پڑتی
ہے۔ دوسری قسم ان اصحاب کی ہے جو بمشکل دیباچہ لکھنا منظور فرماتے ہیں لیکن اگر ہاں کہہ دیں تو دیباچہ ضرور
لکھ دیتے ہیں۔ لیکن ان سے دیباچہ لکھوانا مہنگا پڑتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کی
قیمت دینی پڑتی ہے بلکہ اس لیے کہ مضامین میں ردّ و بدل کرنا پڑتا ہے۔ یا کسی مضمون
کو نئے سرے سے ہی لکھنا پڑتا ہے۔ تیسری قسم ان دیباچہ لکھنے والوں کی ہے جو
دیباچہ لکھنے سے کبھی انکار نہیں کرتے نہ ان کی نیت ہوتی ہے کہ وہ دیباچہ لکھ کر نہیں
دیں گے۔ لیکن لکھتے جب ہیں جب دیباچہ لکھوانے والا ان کا ناک میں دم کر دے۔
چوتھی قسم کے وہ لوگ ہیں جو ہاں کہتے ہیں نہ ناں، لیکن اگر مضامین لکھنے والا مجبور کرے
تو مضامین رکھ لیتے ہیں اور دیباچہ تب لکھتے ہیں۔ جب مضامین لکھنے والا اپنے
مضامین کو واپس لے جانے پر بضد ہوتا ہے۔ اور پھر جبھی لکھ دیتے ہیں لیکن مضامین
میں سے کچھ پڑھ کر، کچھ سُن کر۔ پانچویں قسم محنتانہ لینے والوں کی ہوتی ہے۔ اور وہ
محنت سے دیباچہ لکھتے ہیں۔ آخری قسم ان کی ہے جن سے جب چاہو دیباچہ لکھوالو۔
نہ ان کو غرض مضامین سے ہے نہ مضامین کے لکھنے والے سے۔ جتنا عوضانہ ملے گا
ویسا ہی دیباچہ لکھ دیں گے۔

وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ اور عین ممکن ہے دیباچہ لکھنے والوں کی
ایک اور قسم پیدا ہو جائے۔ جو بغیر مضامین کے دیباچہ لکھ کر دے دیا کریں گے اور دیباچے
کے حساب سے کتاب ترتیب دی جایا کرے گی یعنی دیباچوں سے مضامین بنا کریں گے۔

دیباچہ نہ ہو تو کتاب نامکمل۔ دیباچہ مستند ادیب کا نہ ہو تو بے لطفی۔ کچھ خریدار تو کتاب ہی جب خریدتے ہیں جب وہ یہ دیکھ لیتے ہیں کہ دیباچہ کس نے لکھا ہے اور اس میں کیا لکھا ہے۔ مضامین بھلے ہی دیباچہ سے بہتر ہوں لیکن قیمت دیباچے کی پہلے پڑتی ہے۔ یا یوں سمجھیئے کہ دیباچہ پہلے بکتا ہے اور مضامین بعد میں۔

اس کتاب کے مضامین مزاحیہ تھے۔ دیباچہ کسی مزاح نگار سے ہی لکھوانا تھا پہلے تو دیباچہ لکھنے والوں کا دائرہ ہی تنگ ہوگیا۔ پھر مشہور مزاح نگاروں میں بہت سے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ اس پر مصیبت یہ کہ کوئی معمولی ادیب بھی میرا واقف نہ تھا مستند مزاح نگاروں کی بات تو دوسری رہی۔ آخر بہت غور و خوض کے بعد میں بہ نفس نفیس ایک مستند مزاح نگار کی خدمت میں جا حاضر ہوا اور خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ انھوں نے مجھ سے کہا۔ ۔ ۔ ”میں نے تمھارا نام تک کبھی نہیں سُنا۔ کسی اخبار یا رسالے میں تمھارا مضمون نہیں دیکھا۔ آج کل تو ادیب ایک مضمون لکھ کر ڈھنڈورہ پٹوا دیتے ہیں۔ اور تم ہو کہ مضامین کا پلندہ لیے پھرتے ہو اور بغیر کسی کو ساتھ لیے میرے پاس آدھمکے ہو۔“ اور پھر مجھ سے پوچھا: ”کہاں کے رہنے والے ہو، کیا کرتے ہو، مضمون لکھنا کس سے سیکھا ہے۔ اگر کسی سے نہیں سیکھا تو کیوں؟ کب سے لکھتے ہو۔ کیوں لکھتے ہو۔ ان مضامین میں تمھارا اپنا مال کتنا ہے۔ اور مال مسروقہ ہے تو کتنا۔ مال مسروقہ کیوں لیا گیا ہے۔ کس کس ادیب کا ہے۔ اور اگر مال مسروقہ نہیں تو کیوں نہیں۔ یہ بیماری خاندانی ہے یا ابھی پیدا ہوئی ہے۔ کیا نثر اور نظم دونوں لکھتے ہو۔ اگر صرف نثر ہی لکھتے ہو تو نظم کیوں نہیں لکھتے۔“ آخر میں فرمایا ”میری ان باتوں کا اور اُن باتوں کا جن کو میں پوچھنا بھول گیا فوراً جواب دو۔“ میں نے پہلے تو ان کی باتوں کو مزاح سمجھا لیکن پھر ہر بات کا جواب دیا۔ اطمینان ہو جانے پر انھوں نے مضامین رکھ لیے۔ بہت چکر لگائے نہ انھوں نے مضامین واپس کیے۔ نہ دیباچہ لکھ کر دیا۔ آخر ہمت کی اور بگڑی ہوئی شکل میں مضامین اُٹھا لایا۔ اتنی محنت تو مضامین لکھنے پر نہ ہوئی تھی جتنی دیباچہ لکھوانے پر ہو چکی تھی۔ آخر ایک

ادیب سے واقفیت پیدا کی اور ان کے ہمراہ ایک دوسرے مستند مزاح نگار سے ملا۔ انھوں نے فرمایا۔ . . "مزاح میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب اور گنجائش کہاں۔ گنجائش ہوتی تو وہ خود ہی اور نہ لکھ دیتے۔" میں نے عرض کیا "جس طرح ہر لمحہ نئے انسان نئی شکل اور نیا دماغ لے کر پیدا ہوتے ہیں اسی طرح ہر لمحہ نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک خیال پر مختلف شعرا نے اشعار کہے ہیں اور آج تک مختلف اشعار کہے جا رہے ہیں۔ نیا خیال ملتا ہے تو اس پر مختلف شعرا اپنا خیال دیتے ہیں یہی حالت نثر نگاروں کی ہے۔" میری یہ بات سن کر پہلے تو وہ سٹپٹائے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ دیکھیں لکھا کیا ہے۔ مضامین رکھ لیے لیکن اس شرط پر کہ اگر کوئی نئی بات ہو گی تو دیباچہ لکھ کر دیں گے۔ بہت چکر لگائے۔ سفارشیں بھی بھیجیں۔ لیکن مضامین واپس ملے نہ دیباچہ۔ آخر کوشش سے مضامین واپس لیے۔ لیکن ان کی شکل بھی بگڑ چکی تھی۔

دونوں مزاح نگاروں نے دیباچہ لکھنے سے انکار نہیں کیا۔ دونوں نے لکھ کر بھی نہیں دیا۔ دونوں نے مضامین مشکل سے واپس کیے۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ مضامین دونوں نے پڑھے تھے۔ اب جو سراغ رسانی کی گئی تو معلوم ہوا کہ اگر وہ دیباچہ لکھ دیتے تو ان کی کتاب کو کون پوچھتا۔

آخر میں نے اس کتاب کا دیباچہ لکھ دیا ہے اور میں دیباچے کو اور کتاب کو نذرِ ناظرین کرتا ہوں۔

لِفافہ

"چپراسی"

"جی"

"چپراسی کو بلاؤ"

"جی میں حاضر ہوں"

"اچھا - لیکن میں نے تمھیں کس لیے بلایا تھا"

"جناب مجھے کیا معلوم!"

"تمھیں کچھ معلوم بھی ہوتا ہے - اچھا جاؤ - دس منٹ کے بعد آنا - جب تک وہ کام مجھے یاد آجائے گا"

"جی بہت اچھا"

"سمجھ گئے۔"

"جی ہاں۔"

"اچھا ٹھہرو۔ مجھے وہ بات یاد آگئی۔"

"فرمائیے۔"

"تم نے ڈاکخانہ دیکھا ہے۔"

"جی ہاں۔"

"ارے یہاں پچاسوں ڈاکخانے ہیں۔ میں جس ڈاکخانے کی بات کر رہا ہوں وہ دیکھا ہے۔"

"جناب کس ڈاکخانے کی بات کر رہے ہیں۔"

"میں سمجھنے لگ گیا تھا کہ تم اب سمجھنے لگ گئے ہو۔ لیکن تم نرے کودن ہو۔"

"ہاں حضور ایسا ہی ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم نے بڑا ڈاکخانہ دیکھا ہے۔"

"جی ہاں!"

"کہاں ہے۔"

"جی سترہ سیکٹر میں۔"

"وہاں کہاں۔"

"جی سنٹرل لائبریری کے پاس۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ اب مجھے یقین ہے تم میرا خط پوسٹ کر سکو گے۔"

"جناب میں خط تو روز ہی پوسٹ کرتا ہوں۔ مجھے یہ کام بخوبی آتا ہے۔"

"خاموش رہو۔ یہ تمھارے خط کی بات نہیں۔ ہمارے خط کی بات ہے۔ پہلے پوری بات سُنا کرو۔"

"اچھا یہ لفافہ لو اور اسے اچھی طرح دیکھو۔"

"دیکھ لیا جناب! میں ابھی گیا اور پوسٹ کر کے آیا۔"

"ارے ٹھہرو پہلے یہ دیکھو۔ یہ لفافہ کھلا ہے یا بند؟"

"بند ہے جناب۔"

"اچھا اب یہ دیکھو اس میں کوئی کاغذ پڑا ہوا ہے۔"

"جی ہاں پڑا ہے۔"

"بس ٹھیک ہے۔ یہی لفافہ بڑے ڈاکخانے کے بڑے لیٹر بکس میں ڈالنا ہے۔ دیکھنا اس کے پاس پڑے چھوٹے لیٹر بکس میں نہ ڈال دینا۔"

"جناب آپ بالکل بے فکر رہیں۔ میں یہ لفافہ ابھی پوسٹ کر کے آتا ہوں۔"

"لیکن جاؤ گے کیسے؟"

"سائیکل پر جناب۔"

"نہیں نہیں۔ سائیکل پر جانا ٹھیک نہیں۔ لفافہ جیب سے پھسل کر نکل سکتا ہے۔ سائیکل کی ٹکر ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر صاحب میں بس میں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں یہ بھی نہیں۔ بس میں کرایہ دینا پڑے گا۔ پھر بس میں جیب کترے ہوتے ہیں۔ کوئی لفافہ نکال کر لے گیا تو کیا کرو گے؟"

"اور جس طریق سے آپ حکم دیں۔"

"اچھا سنو اور غور سے سنو۔ پہلے اس لفافے کو دائیں ہاتھ میں پکڑ لو اور پیدل جاؤ۔ راستے میں لفافے کو دیکھتے جاؤ کہ تمہارے ہاتھ میں ہی ہے۔ اور یہی لفافہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ بھی خیال رکھو کہ راستے میں تمہاری ٹکر نہ ہو جائے میرا مطلب ہے کہ ایک آنکھ لفافے پر رہے، دوسری سڑک پر۔ راستے میں کسی سے بات نہ کرنا اور اگر کوئی واقف مل جائے تو ٹل جانا۔"

"جی میں نے اچھی طرح سن لیا۔"

"اور سمجھ بھی لیا؟"

"جی ہاں۔"

"اور سنو، یہ بات کسی سے نہ بتانا کہ یہ لفافہ تمھیں مَیں نے دیا ہے۔"

"بہت اچھا جناب۔"

"اچھا یہ بتاؤ لفافہ کس طرح پوسٹ کروگے۔"

"حضور لیٹر بکس میں اور وہ بھی بڑے لیٹر بکس میں لفافہ اس طرح ڈال دوں گا جیسے اور لوگ ڈال دیتے ہیں۔"

"تو یہ بات بھی سمجھ لو کہ جب تم لیٹر بکس کے پاس پہنچو اس کو چاروں طرف سے دیکھنا کہ یہ بڑا لیٹر بکس ہی ہے اور پھر یہ اطمینان کرنا کہ یہ لیٹر بکس بڑے ڈاکخانے کا ہی ہے۔ لفافہ لیٹر بکس میں ڈالنے سے پہلے اپنے ہاتھ کو پھر دیکھنا کہ وہی لفافہ ہے جو مَیں نے تمھیں دیا ہے۔ پھر یہ اطمینان کرنا کہ اس پر ٹکٹ لگے ہوئے ہیں۔ اور یہ اچھی طرح بند ہے۔ پھر ادھر اُدھر دیکھنا کہ تمھیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ یعنی اس وقت لفافہ پوسٹ کرنا جب وہاں کوئی نہ ہو۔ پھر ہاتھ بڑھا کر لفافہ ڈال دینا اور فوراً واپس آنا۔"

"اچھا جناب۔ لفافہ ڈالتے ہی مَیں فوراً واپس آکر آپ کو اطلاع دوں گا۔"

"ارے ٹھہرو۔ ہاتھ باہر نکال کر پھر اطمینان کرنا کہ لفافہ تمھارے ہاتھ میں تو نہیں رہ گیا۔"

"جناب ایک عرض ہے۔"

"ہاں کہو۔ بلا جھجک کہو۔"

"جناب مَیں ایک اور احتیاط برتنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا؟"

"وہ حضور یہ کہ مَیں پہلے اپنا کان لیٹر بکس کے ساتھ لگا لوں گا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر لفافہ اندر کی طرف بکس کی دیوار سے ماروں گا۔ اور پھر لفافہ گرنے کی آواز کو سننے کی کوشش کروں گا۔"

"بہت خوب۔ تم بہت سمجھدار ہو۔ مَیں تمھاری ترقی کی سفارش کر دوں گا۔

اب تم لفافہ ڈال کر آؤ، میں تمھارا انتظار کروں گا۔"

"بس گیا حضور۔"

"ارے جلدی نہیں، آہستہ اور احتیاط سے جاؤ۔ کہیں ٹکّر نہ کھا جانا۔ لفافہ گرا کر آواز سُننا نہ بھولنا۔ اور واپس بہت جلد آنا۔ جاتے جاتے شاموں کو بتاتے جانا۔"

"شاموں! میں ایک لفافہ لیٹر بکس میں ڈالنے جا رہا ہوں۔ تم پیچھے صاحب کا خیال رکھنا۔ میں کوشش کروں گا کہ جلد واپس آجاؤں۔"

"مگر لیٹر بکس تو چند قدم پر ہی ہے۔"

"ارے شاموں، میں واپس آکر تمھیں کہانی سُناؤں گا۔ اب مجھے جانے دے۔"

"ٹھیک ہے۔"

"شاموں۔"

"جی جناب!"

"میں نے تمھارے ساتھی کو ایک کام کے لیے بھیجا ہے۔ کیا وہ چلا گیا؟"

"جی ہاں۔"

"ارے دیکھ۔ شاید یہیں کہیں ہو۔ جلدی دیکھ۔"

"جی، میں سب جگہ دیکھ آیا۔ وہ تو چلا گیا۔"

"ارے غضب ہو گیا۔ تم بھاگ کر بڑے ڈاکخانے کی طرف جاؤ اور اسے لفافہ پوسٹ کرنے سے منع کرو۔ اور اسے لفافے کے ساتھ احتیاط سے واپس لے آؤ۔"

"بہت اچھا جناب!"

"سکوٹر سے چلے جاؤ اور فوراً اسے روکو۔ واپس پیدل آنا۔"

"اچھا جناب۔"

"جناب یہ ایک ضروری کیس آپ نے منگایا تھا، دیکھ لیجیے۔"

"یہ کیس ہیں چھوڑو اور یہ دیکھو کہ کیا شاموں چلا گیا۔"

"جی میں سب جگہ دیکھ آیا۔ کس کام سے کہاں گیا ہے۔"

"ارے خاموش۔ جب تک وہ لوگ واپس نہیں آ جاتے میں اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔ میں ایک غلطی پہلے ہی کر چکا ہوں۔"

"لیکن جناب کیسی غلطی ہو گئی۔"

"جناب یہ لیجیے لفافہ۔"

"شاباش، یہ لفافہ میں خود پوسٹ کروں گا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں سے۔"

بچہ پیدا ہوتا ہے۔ دُنیا میں تشریف لانے پر سب سے پہلا کام جو
اس کا ہوتا ہے وہ ہے بولنا بلکہ چینخنا، چلّانا، اس کی آمد کا پتہ انتظار کرنے والوں کو
اس کے بولنے سے ہی لگ جاتا ہے۔ وہ بولا نہیں اور سب خوشی کے مارے بولے نہیں
یکدم خوشی کا شور و غل، چینخ پکار شروع ہو جاتی ہے۔ اگر بچہ نہیں بولتا یا نہیں
چلّاتا تو اُسے الٹا لٹکا دیا جاتا ہے۔ اور اس کو چلّانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور
اگر پھر بھی وہ نہیں چلّاتا تو ڈاکٹر چلّاتا ہے۔ نرسیں چلّاتی ہیں۔ ماں باپ رشتہ دار
سب چلّاتے ہیں۔ اور یہ چینخ پکار تب تک چلتی ہے جب تک بچہ نہیں چلّاتا۔ بچہ
چلّایا تو پھر خوشی کا شور و غل، چینخ پکار شروع ہو جاتی ہے۔ بچے کو ماں دودھ نہیں
دیتی۔ جب تک وہ نہیں چلّاتا۔ زندگی شروع ہوتی ہے۔ بولنے سے بلکہ چینخنے چلّانے

سے۔

بچہ بڑھتا ہے۔ ابھی بولنے کے قابل نہیں ہوا۔ پھر بھی سب چاہتے ہیں بولے، اسے بُلایا جاتا ہے بول کر۔ بولتے اشاروں سے بولتے کھلونوں سے وہ دیر میں بیٹھنا سیکھے۔ منظور، وہ دیر میں چلنا سیکھے منظور۔ لیکن وہ دیر میں بولنا سیکھے نامنظور، زندگی چلتی ہے بولنے سے۔

بچہ بڑا ہوا۔ بولنے لگا۔ سب خوش ہوئے۔ اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے خوب بولتے ہیں۔ گھر کا کام ٹھپ پڑا ہے پڑا رہے۔ کھانا تیار نہیں ہوا نہ سہی اسی خوشی میں پیٹ بھر رہا ہے کہ بچہ بولنے لگ گیا ہے۔ اسے بلانے کے لیے سب بولتے ہیں۔ اور سب چاہتے ہیں کہ وہ بولے اور بولتا رہے۔ ان کی تسکین اسی میں ہے۔ بولنے والا بچہ سب کو پیارا ہے اور اگر وہ اچانک بولنا بند کر دے تو سب بول اُٹھیں گے۔ بھاگو، دوڑو، ڈاکٹر کو بلاؤ، وئید کو بلاؤ، حکیم کو بلاؤ۔ بچے نے بولنا کیوں بند کر دیا۔ ڈاکٹر بولتا ہے، وئید بولتا ہے۔ حکیم بولتا ہے۔ بچہ بول پڑتا ہے اور اگر بچہ پھر بھی نہیں بولتا۔ تو ڈاکٹر کا، وئید کا، حکیم کا بولنا بند کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ان کو گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ پھر دعاؤں کے لیے ہاتھ پھیلائے جاتے ہیں۔ منّتیں مانی جاتی ہیں۔ بچہ نہیں بولتا، گھر دوزخ ہے۔ بچہ بولتا ہے گھر دوزخ ہوتے ہوئے بھی بہشت ہے۔ زندگی، زندگی ہے بولنے سے۔

بچہ بچپن کی حدود سے گزر گیا۔ بولنے والے معمولی بولنے والے نہیں۔ پڑھیا بولنے والے لیکچرار، اتالیق مقرر کیے گئے۔ پڑھ کر گھر واپس آیا۔ سب سے پہلا سوال گھر آنے پر یہ ہوگا کہ بولو کیا پڑھا۔ اس نے بول کر سب کچھ بتا دیا۔ سب خوش کہیں گے ہوشیار ہے۔ خاموش رہا۔ کچھ نہیں بولتا یا کم بولتا ہے، کہیں گے ہوشیار نہیں سب بولنا بند کر دیں گے۔ آخر بولیں تو کیا بولیں۔ بچہ فر فر بولتا تو آپس میں بولتے محلے والوں سے بولتے۔ اتالیق سے بولتے۔ زندگی بنیتی ہے بولنے سے۔

بچہ جوان ہوا۔ خوب بول سکتا ہے تو بحث کر سکتا ہے۔ لیکچرار بن سکتا ہے۔

مقرر بن سکتا ہے، لیڈر بن سکتا ہے، بلڈر بن سکتا ہے، ایم ایل اے بن سکتا ہے
ایم پی بن سکتا ہے، منسٹر بن سکتا ہے، گورنر بن سکتا ہے، پریذیڈنٹ بن سکتا ہے
کسی انجمن کا، کسی میونسپلٹی کا، بلکہ ملک کا بھی۔ زندگی نکھرتی ہے بولنے سے۔

بچہ بوڑھا ہو گیا۔ تشریف لے جانے کا وقت آپہنچا۔ بولنا بند ہو گیا۔
سانس بند ہو گئی۔ پھر ماں، باپ رشتہ داروں کا بولنا بلکہ چیخنا چلانا شروع ہو گیا۔
زندگی ختم ہوتی ہے بولنے سے بلکہ چیخنے چلانے سے۔

یہ نظامِ قدرت ہے۔ اس لیے بولیے میرے لیے نہیں خدا کے واسطے بولیے، بولیے
تاکہ آپ کو اطمینان ہو جائے کہ آپ کا بولنا بند نہیں ہو گیا۔ شیخ سعدی نے ایک وقت
کی بات ہے کہا تھا:

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آج کل ذکر ہے تو مرزا غالب کا، فکر ہے تو مرزا غالب کا۔ اب
وہ فرماتے ہیں:

پھر دیکھیے اندازِ گُل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

بولنا ایک آرٹ ہے۔ یہ آرٹ بول کر سکھایا جاتا ہے۔ بول کر ہی آتا ہے۔
واعظ کو دیکھیے ان کو بولنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ جتنا زیادہ اور جتنا عمدہ بولے گا
اتنا ہی بڑا واعظ۔ آپ آرٹسٹ بنیے۔ لیکچرار بنیے، شاعر بنیے، واعظ بنیے، آپ کیا
بننا چاہتے ہیں۔ سوچیے اور اس اثنا میں میری ایک مختصر کہانی میری اپنی زبانی
سُنیے:

بہت دنوں کی بات ہے، میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ پڑھتا کم تھا اور
بولتا زیادہ تھا۔ ماسٹر جی کم بولتے تھے۔ میری نظر میں انھیں اس لیے کچھ نہیں آتا
تھا اور شاید اسی لیے مجھے بھی کچھ نہیں آیا۔ ایک دن سب کے سامنے مجھے فرمانے

لگے۔ ۔ ۔ " عزیز کم بولا کرو۔ ایک بات کہا کرو اور دو سُنا کرو، کہ حق نے زباں ایک دی کان دو ۔ ۔ ۔ ۔ بس اتنی سی بات پر میرے ہم جماعتوں نے میری کھلی اُڑا دی۔ خوب تالیاں بجائیں۔ ان کی نظر میں میں پٹ گیا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ ۔ " سنیے! ماسٹر جی نے اس مصرع کا مطلب غلط سمجھا ہے۔ حق نے زبان کو دو کانوں کے بیچ رکھا ہے اس لیے کہ دونوں کان زبان کی بات کو صاف صاف سن سکیں اور آواز کو سننے کا لطف اٹھا سکیں۔ دونوں کان زبان سے چھوٹے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کان گز بھر کی زبان۔ پھر ایک ہی زبان اتنا بول سکتی ہے کہ دونوں کان تھک جائیں۔ لیکن زبان نہ تھکے۔ ایک ہی زبان کئی زبانیں کئی زبانیں بول سکتی ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ آج تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا کہ زبان کی اصلی زبان کون سی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زبان کا لفظ تیر بہدف ہے۔ خلا میں ٹھہرتا ہے، ریکارڈ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کانوں کا کیا اعتبار، ایک کان سے سُنا اور دوسرے سے اُڑا دیا۔ اور پھر زبان کچھ دینا جانتی ہے جبکہ کان محض لینا ہی جانتے ہیں۔ ابھی میں اپنے دلائل پیش کر رہا تھا کہ سبھی لڑکوں نے میرے حق میں زندہ باد پائندہ باد کے نعرے، نہیں نہیں فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیے اور میری طبیعت کو سکون پہنچایا۔ ماسٹر جی کو تو پھر کبھی بولنے کا موقع نصیب ہی نہیں ہوا۔ حالانکہ انھوں نے کوشش بھی بہت کی۔ جب سے بولنے کی ایسی پریکٹس ہوئی ہے کہ اور سب باتوں میں پھسڈی رہا، لیکن بولنے میں کسی کو بولنے نہیں دیا۔ اب بھی دیکھ لو میں کب سے بول رہا ہوں اور آپ کا بولنا بند ہے۔ لیجیے میں یہ بات اور کھول کر بولتا ہوں۔ آپ مانیں گے، زبان بولتی ہے۔ جو خوبیاں خدائے قدیر نے زبان کو عطا فرمائی ہیں، اور کسی عضو کو نہیں بخشیں۔ زبان پر کوئی قید نہیں۔ جہاں چاہے جس طرح چاہے، جب چاہے، جدھر چاہے، جو چاہے بول سکتی ہے۔ آہستہ، تیز، رُک رُک کر بول سکتی ہے۔ آپ یہ بھی مانیں گے کہ اس کا مقام ایک تنگ جگہ میں ہے۔ لیکن یہ چل سکتی ہے آہستہ، تیز، قینچی کی طرح، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے، دائیں بائیں اِدھر اُدھر چل سکتی ہے، تہذیب سے

شرافت سے، سنجیدگی سے، شعور سے عقل سے، تمیز سے چل سکتی ہے۔ اُن کے الٹے بھی چل سکتی ہے اور پھر اُلٹ کر پلیٹ سکتی ہے۔ صاف بول سکتی ہے، لکنت سے بول سکتی ہے، تتلا کر بول سکتی ہے۔ انسانوں اور جانوروں کی بولی بول سکتی ہے۔ آپ اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ یہ نوکیلی زبانِ مبارک بتیس نوکیلے اور تیز دانتوں کے ساتھ ہر وقت ٹکر لیتی رہتی ہے۔ وہ دانت جو جانوروں کی تو بساط ہی کیا انسانوں کو کچا چبا جائیں ہر وقت اس زبان سے ڈرتے ہیں کہ یہ کوئی ایسا بول نہ بول دے کہ کوئی منچلا جو بولنے میں کم یقین رکھتا ہو ان کو نکال کر ہی نہ رکھ دے۔ یہ دانت رہیں یا نہ رہیں لیکن زبان اپنی جگہ پر رہے گی۔ ڈٹی ہوئی، ٹکر لیتی ہوئی نڈر اور بے خوف، حق نے زبان بولنے کے لئے دی ہے خاموش رہنے کے لیے نہیں۔ اب آپ بولتے ہی نہیں تو اسے رکھنے کا کیا فائدہ۔ نکال پھینکیے۔ زبان ہے اور اس کا مناسب استعمال نہیں۔ یہ زبان کی بے عزتی ہے اور زبان بنانے والے کی بھی۔

میں آپ کو سمجھانے کے لیے اور بولتا۔ لیکن میرا وقت ہو گیا ہے اور مجھے ایک اور جگہ بولنا ہے جہاں میرا بولنے میں مقابلہ ہے۔ یقیناً میرا ہی بول بالا ہوگا۔

مُلاقات

"منگل!"

"جی!"

"سُنو۔ ۔ ۔ آج ہم بہت مشغول ہیں کسی سے ملاقات نہ کریں گے۔ پرسنل اسسٹنٹ اور پرائیویٹ سکریٹری کو بتا دو۔"

"مگر حضور، آپ سے ملاقات کے لیے تو بہت زیادہ لوگ آتے ہیں، کِن کِن کو منع کروں گا اور پھر حضور، آپ کے تعلّقات اتنے ہیں کہ باہر دُور دراز سے بھی لوگ آتے ہیں، کیا ان کو بھی روک دوں؟"

"محض ایک آدھ کو۔ ۔ ۔ وہ بھی جو بہت دُور سے آئے۔ ۔ ۔ ملنے کی اجازت ہے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"ہمیں وزیر صاحب سے ملنا ہے۔"

"آج ان سے ملاقات نہیں ہوسکتی - وہ بہت ضروری کام کر رہے ہیں جلد ہی انھیں ایک میٹنگ میں جانا ہے۔"

"مگر انھوں نے آج ملاقات کی تاریخ دی ہے یہ دیکھیے خط . . . اس کے علاوہ ہم بہت دُور سے آئے ہیں، اور بات صرف پانچ منٹ کی ہے۔"

"لیکن یہ حکم بھی وزیر صاحب کا ہے کہ وہ آج کسی سے نہیں مل سکتے۔"

"ہم تمھیں ملاقات کے بعد انعام دے کر جائیں گے۔"

"مَیں کوشش کرتا ہوں - اُمید کم ہے۔"

"سکریٹری صاحب! باہر دو سیٹھ، وزیر صاحب سے ملاقات کے لیے آئے ہیں یہ خط دیا ہے - کہتے ہیں آج انھیں بلایا گیا ہے۔"

"ارے یہ کیا مصیبت میں ڈال دیا . . . اچھا، انھیں اندر بھیج دو۔"

"جناب آداب!"

"آداب، تشریف رکھیے - آپ کو باہر منگل نے بتا ہی دیا ہے کہ آج وزیر صاحب ملاقات نہیں کریں گے - کل تشریف لے آئیں مَیں آپ کو ملوا دوں گا۔"

"مگر جناب ہم کاروباری بندے ہیں - بات صرف پانچ منٹ کی ہے، ہمارا کافی نقصان ہو جائے گا - کل ہمیں ایک اور جگہ وقتِ مقررہ پر پہنچنا ہے، اگر ہمیں تاریخ نہ ملی ہوتی تو . . ."

"میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں، اُمید کم ہے۔"

"حضور دو سیٹھ دُور سے آئے ہیں - انھیں آج ملاقات کا وقت دیا ہوا ہے کہتے ہیں محض پانچ منٹ میں اپنی بات کہہ دیں گے۔"

"لیکن تم نے ملاقات کا وقت آج ہی کیوں دیا۔ آئندہ محتاط رہو۔
انھیں بھیج دو۔"

"آپ دائیں ہاتھ کے دروازے سے بڑے کمرے میں چلے جائیں۔ کوشش
کرنا کہ بات دو چار منٹ میں ہی ختم ہو جائے۔"

"آداب حضور!"

"آداب! آپ کو میرے سکریٹری نے بتا دیا ہو گا کہ آج میں بہت مصروف ہوں۔
ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں ہے۔ اگر آپ کل تشریف لے آئیں تو مناسب رہے گا۔"

"مگر حضور، کل ہمیں کہیں اور جانا ہے۔ بات ہماری چار منٹ میں
ختم ہو جائے گی۔"

"یہی تو مصیبت ہے کہ یہ چار منٹ کہاں سے لاؤں۔ میرے پاس تو ایک
منٹ بھی نہیں ہوتا۔ مجھے تو مرنے کی بھی فرصت نہیں۔ سُنیے۔ . . ! صبح ۶ بجے
اُٹھتا ہوں۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر فائلیں لے کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ہر لفظ
پڑھتا ہوں، تولتا ہوں۔ پرکھتا ہوں، سونگھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں۔ بار
بار سوچ کر جب نتیجہ نکالتا ہوں تو وہ فیصلہ لکھ دیتا ہوں۔ کبھی کسی سے رعایت
نہیں کرتا۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ اوّل تو میرے فیصلوں کے خلاف کسی نے
اپیل کرنے کی ہمت نہیں کی، اور اگر کی تو مُنہ کی کھائی۔ سپریم کورٹ تک میرے فیصلے
برقرار رہے۔ اب آپ بتائیے کہ وقت کہاں ہے، آرام کہاں، پوجیہ پنڈت جواہر لعل
نہرو فرمایا کرتے تھے: "آرام حرام ہے ——" دن میں ایک آدھ غیر
ممالک سے ڈیلی گیشن بھی آتا ہے۔ اب انھیں سب بتانا پڑتا ہے ریڈیو نہ سنوں
تو مشکل، ٹیلی ویژن نہ دیکھوں تو مصیبت، اخباروں کا پڑھنا بہت ضروری۔
دن میں کوئی نہ کوئی سیمینار ہوتا رہتا ہے، اس میں ایک تقریر بھی ہوتی ہے، بحث و
مباحثہ بھی ہوتا ہے۔ پھر اخباروں میں اس کا ذکر ہونا بھی ضروری ہے۔ ڈرتا رہتا
ہوں کہ کوئی میری تقریر کو توڑ مروڑ کر نہ لکھ دے، اس لیے اخباروں کو گہرائی سے

پڑھتا ہوں، یہ کام مَیں کسی اور کو بھی نہیں دیتا۔ ملنے والوں کا تانتا الگ . . .
کوئی رشتہ دار کو لیے آتا ہے، کوئی سفارش لے کر پہنچتا ہے، بہت کہتا ہوں جو
کچھ کہنا ہے لکھ کر بھیج دو۔ مَیں پڑھ لوں گا۔ مگر کام ناجائز کرانا چاہتے ہیں، لکھ کر
کیسے دیں۔ بہت منع کرتا ہوں، مگر مانتے نہیں۔ اس ملک سے بھرشٹا چار ختم ہو تو
کیسے؟ سچ پوچھیے، گھر کی کبھی خبر نہیں لی۔ بیوی ناراض، بچے دُکھی، کسی سے
بات کرنے کی فرصت نہیں۔ اُدگھاٹن، ورائٹی شو، اور غضب تو یہ ہے کہ ملنے
والوں کو نہ جانے کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ وہاں پہنچ جاتے ہیں، غرضیکہ . . .
ایک منٹ معاف فرمائیں۔

"کیا بات ہے؟"

"حضور ڈاک آگئی ہے، آج تو بہت ہے، کچھ فارن سے چٹھیاں آئی
ہیں۔ بہت دعوت نامے ہیں۔ اور . . ."

"ٹھیک ہے فوراً بھیج دو۔"

"دیکھا آپ صاحبان نے . . . آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں ڈاک
سرسری نظر سے دیکھوں گا اور نیچے پھینک دوں گا۔ جی نہیں۔ ہر خط کا جواب
خود لکھواتا ہوں۔ خاص خطوط کے جواب مَیں خود لکھتا ہوں۔ مَیں نے اعلیٰ تعلیم
اس لیے تھوڑا ہی حاصل کی ہے کہ دوسروں پر بھروسہ کروں یا اُن پر نربھر
رہوں۔ اور ہاں ایک منٹ . . .

"سکریٹری کیا بات ہے . . . مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔ میں بہت
ضروری باتیں کر رہا ہوں۔"

"مگر حضور! آپ نے ہمیں تو چار منٹ نہیں دیے اور ہمارے بیس
منٹ لے لیے اور ایک دفعہ ہمیں آپ نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔"

"افسوس، مَیں بھول گیا۔ تشریف رکھیے۔ مَیں آپ کے لیے چائے
منگواتا ہوں، آپ بھی کیا کہیں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، کہ مجھے ایک منٹ

کی بھی فرصت نہیں ملتی اور۔ ۔ ۔"

"ارے، کیا آپ چل دیے؟ ۔ ۔ ۔ پوری بات بھی نہیں سنیں گے کیا آپ ۔ ۔ ۔"

کہاں چھپے رہے

میں نے اپنی زندگی میں بہت کچھ بننے کی خواہش کی اور کوشش بھی کی۔ لیکن جب کچھ بھی نہ بن سکا تو ادیب بننے کا خیال آیا۔

ادب مختلف اقسام کا ہے۔ ترقی پسند ادب، معیاری ادب، بازاری ادب لطیف ادب، کثیف ادب، شعوری ادب، فحش ادب، عریاں ادب، اشتراکی ادب سرمایہ پرست ادب، بیوپاری ادب، کلاسیکی ادب، جنسی ادب، مزاحیہ ادب، طنزیہ ادب، تنقیدی ادب، تردیدی ادب، ادب جو ادب ہے۔ ادب جو بہت بڑی بے ادبی ہے۔ مجھے یہ سب ادب پسند ہیں۔ ادب کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ بقولیکہ :

ادب، ادیب، ادب کا نہیں کوئی مذہب
خدا کے فضل سے یہ کفر ہے نہ یہ اسلام!

مَیں بڑے شہروں میں نہیں گیا۔ جہاں فٹ پاتھوں پر بچے پیدا ہوتے ہیں۔ پلتے ہیں اور مرتے ہیں۔ اور دوسری طرف عالی شان عمارتوں میں زندگیاں پنپتی ہیں۔ کھلتی ہیں اور اپنے ماحول کو مہکاتی ہیں جنھیں دیکھ کر ادب پیدا ہوتا ہے پنپتا ہے اور ادبیت رنگ نکھارتی ہے۔ مَیں نے کبھی فاقے نہیں کاٹے نہ مجھے کبھی مُرغن غذائیں دستیاب ہوئی ہیں۔ فکر و فاقہ ادیب بناتا ہے یا پھر بے فکری۔ مَیں نے کبھی کسی کو ٹھے کا رُخ نہیں کیا۔ جہاں سے کچھ سیکھنے کو ملتا۔ اب جانا ضروری ہو گیا تو کو ٹھے ختم ہو گئے۔ قدرت کو ہی مجھے ادیب بنانا منظور نہیں تھا تو حکومت کو کیسے ہوتا۔ میرے دل میں کبھی دھڑکن پیدا نہیں ہوئی۔ نہ مجھے کسی کے دل کی دھڑکن سننے کا موقع ملا۔ جس سے میرے دل میں دھڑکن پیدا ہوتی۔ مَیں نے کسی کی جیب نہیں کاٹی نہ کسی جیب کترے نے میری جیب کاٹی۔ نہ یہ ہوا کہ بچے پیدا نہیں ہوئے نہ وہ بات ہوئی کہ . . . "ہر سال تری گود میں بچہ نظر آیا" جن کے پیدا ہونے پر مضامین پیدا ہوتے۔ مجھے کسی پولیس اسٹیشن جانے کا موقعہ نہیں ملا۔ جہاں میرے دماغ کی چولیں ڈھیلی کی گئی ہوتیں جن سے کوئی آواز نکلتی۔

مجھے کسی نے گالی نہیں دی۔ نہ کسی نے گالی دینے کا سلیقہ سکھایا۔ نہ یہ سلیقہ کسی کتاب میں پڑھنے کو ملا۔ مَیں نے پاگل خانہ بھی نہیں دیکھا۔ کوئی لے کر ہی نہیں گیا۔ حالانکہ کچھ پاگل مجھے کھلم کھلا پاگل کہتے ہیں۔ سُنا ہے کچھ ادیب بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو میرا ابھی چانس ہے اور مَیں اس چانس سے پورا فائدہ اُٹھاؤں گا۔ مجھے علماء کی محفلیں، علمی مباحثے سُننے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ مَیں نے طالب علمی کے زمانے میں درسی کتب میں غزلیں، نظمیں، قصیدے، مرثیے پڑھے تھے۔ لیکن مجھے کسی مدرّس نے شعر کو تخلیق کرنا نہیں سکھایا تھا۔ یا تو اس لیے کہ شعر تراشی کا کام یا اشعار بنانے کا ڈھنگ سکھانا ان کا کام نہیں تھا۔ یا پھر اس لیے کہ مدرّسوں کو شعر بنانے کا خود ہی شعور نہیں تھا۔ مَیں کسی بڑی لائبریری میں نہیں

گیا جہاں ادب بکھرا پڑا ہے۔ جہاں ادیب الماریوں سے نکل کر مجھے جھانکتے اور میرا پیچھا کرتے۔ مجھے باادب بناتے۔ میں کسی ادیب کو نہیں جانتا۔ نہ کوئی ادیب مجھے جانتا ہے۔ ادیب کے پیشِ نظر دُنیا کے مسائل رہتے ہیں وہ ان کی چھان بین کرتا ہے اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق حل پیش کرتا ہے۔ لیکن مجھے نہ کوئی نقطہ ملا نہ نظر۔ میں نے سُنا کہ ادیب بننے کے لیے ساغر، مینا اور ساقی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اعلیٰ قسم کے ساغر اور مینا تو میں لے آیا لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود عمدہ تو کیا ادنیٰ ساقی بھی نہیں ملا۔ جو ساقی کو جانتے ہیں وہ مجھے نہیں جانتے۔ جو مجھے جانتے ہیں ساقی کو نہیں جانتے۔ نہ ساقی آتا ہے نہ ساقی ملتا ہے۔ میری صورت بھی ادیبوں کی سی نہیں۔ اس سے شرافت تو برستی ہے ادب نہیں۔ افکار و خیالات اُوپر سے نہیں اترے۔ تحریر و انشا تبّت سے نہیں ملے۔ خوش کلامی، فصیح البیانی میرے حصہ میں نہیں آئی۔ نہ یہ اشیا بازار میں ملیں۔ ادب آئے تو کہاں سے لایا جائے تو کہاں سے۔ میرے دل میں خود شعر کہنے کی خواہش نے کبھی جنم نہیں لیا۔ شعر کیسے بنتا ہے، کیوں بنایا جاتا ہے، کیوں چھپایا جاتا ہے اس کی مشتہری کیوں کی جاتی ہے۔ کس طرح کی جاتی ہے۔ شعر کہنے کا شعور کہاں سے ملتا ہے۔ شعر لکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ شعر کو کیا فائدہ پہنچا ہے۔ شاعر کو کیا، سامعین کو کیا، ان باتوں کی مجھے کچھ بھی واقفیت نہیں تھی۔

ایک دن ایک مشاعرے میں ایک ملاقاتی جنھیں مشاعروں میں جانے کا شوق، خبط کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اپنے ساتھ مجھے بھی لے گئے۔ پہلے شاعر سے لے کر آخری شاعر تک کا کلام بغور سُنا۔ شعرا کی قدر افزائی دیکھی۔ میرے دل میں بھی اُمنگ اُٹھی کہ میں بھی شعر کہوں۔ آخر جب یہ لوگ شعر کہہ سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں کہہ سکتا۔ ادیب بننے کے خیال نے عملی جامہ پہنانے کا خیال لیا۔ لائبریری پہنچا۔ فہرستیں دیکھیں۔ ایک کتاب ڈھونڈ کر نکالی۔ جس میں ردیف، قافیہ، وزن، مطلع، مقطع وغیرہ سے مکمل واقفیت پہنچائی گئی تھی۔ ایک شعر بنانے کی کوشش کی۔ بہت زور مارا لیکن شعر نہ بنا۔ شعر بن جاتا تھا لیکن میری نظر میں وہ اس قابل ہی نہیں ہوتا تھا کہ سُنایا جائے۔

اس کوشش میں شعر بنانے کا خیال زور پکڑتا گیا اور خیال نے جنون کی شکل اختیار کر لی۔ ۔ ۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ اگر پرانے اور نئے دیوانوں سے ایک ہی ردیف قافیے میں اور وزن کے تناسب سے ایک ایک ایسا شعر سرقہ کر لیا جائے جو عام استعمال نہ ہوتا ہو۔ تو ایک غزل مرتب ہو سکتی ہے۔ اس غزل کو کسی استاد کے پاس لے جا کر اس کی مرمّت کرانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ۔ ۔ مولا دے اور بندہ لے۔ خدا کے فضل و کرم سے غزل مرتّب ہو گئی۔ اب دوسری نشست کا انتظار کرنے لگا۔

اتفاق کی بات ایک مستند ادیب کی تشریف آوری پر خاص نشست کا اہتمام ہوا اور میں بھی جا پہنچا۔ شعرا اور ادباء نے اپنا اپنا کلام پیش کیا۔ جو انھوں نے اپنے دماغ کا عرق نکال کر لکھا تھا۔ خواب، واہ وا ہوئی۔ جب سب سُنانے والے اپنا اپنا کلام سُنا چکے تو میرِ جلسہ نے فرمایا کہ اگر کوئی اور صاحب اپنا کلام سُنانا چاہیں تو تشریف لائیں۔ میں تو اسی انتظار میں بیٹھا تھا۔ کالر کو ٹھیک کیا۔ شیروانی کے کس بل نکالے۔ غزل کا مطلع ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ واہ وا کا شور بلند ہو گیا۔ پوری غزل کہتے کہتے وہ داد ملی کہ شاید ان شعرا کو جن کے وہ اشعار تھے، نہ ملی ہو گی۔ سبھی حیران تھے کہ اس پایہ کی غزل کہنے والے یہ صاحب اب تک کہاں چھپے رہے۔ اس غزل میں میرا ایک بھی شعر نہیں تھا۔ لیکن غزل مال مسروقہ ہے۔ یہ بات نہ کسی کی سمجھ میں آ سکتی تھی نہ آئی۔ اگر ادیب بننے کا خیالِ مبارک شروع میں ہی تشریف لے آیا ہوتا تو ہو سکتا ہے۔ میں بھی اس وقت تک جنابِ میر کی طرح فرما چکا ہوتا:

'مستند ہے میرا فرمایا ہوا'

رسمِ اجراء

بچّو! کل تمھیں ادب اور ادیبوں کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ ایک بات نوٹ کر لو کہ ادب کے بارے میں جو کچھ بتایا جائے اسے ذہن نشیں کر لو۔ اور جو کچھ ادیبوں کے بارے میں بتایا جائے اسے ذہن کی اوپر کی سطح تک ہی رکھ چھوڑ۔ ہاں تو تم پوچھو گے کہ ایسا کیوں ۔ ۔ ۔ ؟ کیونکہ ادب تو پیدا ہی ہی ادیبوں سے ہوتا ہے۔ بچّو! یہ مسئلہ بہت ہی پیچیدہ ہے۔ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو خود بخود سمجھ جاؤ گے۔ ہو سکتا ہے تب تک تم خود ہی ادیب بن جاؤ۔

تو بچّو! آج میں تمھیں رسمِ اجرا کے بارے میں بتاؤں گا۔ رسمِ اجرا کے معنی ہیں کسی چیز کے جاری کیے جانے پر اس کی رسم ادا کرنا۔ یہ رسم کسی چیز کے لیے

بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اَدیبوں نے کمالِ ہوشیاری سے اسے اپنے لیے محدود کر لیا ہے۔ یہ رسم حال ہی کی پیداوار ہے۔ لیکن اس رسم نے بڑی ترقی کی ہے۔ یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ اس رسم کی پیدائش پر کوئی رسم ادا نہیں ہوئی۔ نہ اس کے اجراء کی رسم ادا کی گئی۔ ہاں تو بچو یہ رسم کسی نئی کتاب کے چھپنے کے بعد اور اس کی فروخت سے پہلے اَدا کی جاتی ہے۔ یہ کتاب کی مشتہری کا ایک ذریعہ ہے۔ مشتہری کے بہت طریقے ہیں۔ ڈھنڈورچی کے ذریعہ، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے، اخباروں، رسالوں کے ذریعے، سینیما کے ذریعے، مشتہری کے اور ذرایع صرف رقم خرچ کرنے سے ہی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُس ذریعہ پر خرچ بھی بہت ہوتا ہے اور محنت بھی بہت ہوتی ہے۔ صرف وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو ہتھیلی پر سرسوں جما سکتے ہیں۔

بچو! پہلے وقتوں میں ادیب رسم اجراء کو اس لیے ایجاد نہیں کر سکے کیونکہ وہ اپنی مشتہری کرنا معیوب سمجھتے تھے۔ کتاب منظرِ عام پر آتی تھی۔ ادب نواز فیصلہ صادر فرماتے تھے۔ نقاد حضرات مصنف کی تخلیق کا جائزہ لیتے تھے۔ ایماندارانہ تبصرہ دیتے تھے۔ ادیب مستفید ہوتے تھے۔ ناظرین لطف لیتے تھے۔ یہی ادیبوں کی محنت کا صلہ ہوتا تھا۔ کچھ ادیب ایسے تھے جو فرضی نام سے لکھتے تھے۔ گمنام ادیب گمنام پیدا ہوئے اور گمنام ہی مر گئے۔ ان کے مضامین کا انتظار رہتا تھا۔ لوگ یہ جاننے کے لیے کہ :

کون معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں

بے چین اور بے قرار رہتے تھے۔ اب وہ بات نہیں۔ اب تو بہت ادیب ان گمنام ادیبوں کی تخلیقات ردوبدل کے ساتھ اپنے نام سے چھپواتے ہیں۔ تو بچو! ملک میں حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ لڑکیاں لڑکے نظر آتے ہیں۔ ادب تو نام ہی نئی بات پیدا کرنے کا ہے۔ اور یہ نئی بات پیدا کرتے ہیں ادیب اور شاعر۔ ۔ ادیب ادب میں نئی

بات پیدا کریں تو ادب نکھرتا ہے۔ ادیب اپنے لیے نئی بات پیدا کر دیں تو ادیب نکھرتا ہے۔

اب ادیب کیسے نکھرتا ہے، غور سے سُنو۔ ۔ ۔ تم اخبار اور رسالے پڑھتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کسی رسالے یا اخبار میں کسی نئے شاعر یا ادیب کا کلام چھپتا ہے۔ ان پرچوں میں پھر کچھ خطوط بھی چھپتے ہیں جن میں اس شاعر یا ادیب کی تعریف ہوتی ہے۔ پھر کچھ ایسے خط بھی چھپتے ہیں کہ فاضل مصنف اپنا کلام کتابی صورت میں لائیں تاکہ لائبریریوں اور کتب خانوں کی زینت بنے اور عوام ایک ہی وقت لطف اندوز ہوں۔ بس سمجھیے رسمِ اجرا کی تیاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب ادیب صاحب سودے بازی کرتے ہیں اور کتاب چھپوا لیتے ہیں۔ ان کتب میں ایک کتاب اعلیٰ قسم کے کاغذ پر چھپتی ہے اور اس کی جلد بھی خاص ہوتی ہے۔ بس بچو! یہی وہ خاص کتاب ہے جسے رسمِ اجرا کے وقت خاص مقام دیا جاتا ہے۔

بچو! رسمِ اجراء، جیسا کہ میں نے ابھی بتایا جان جوکھوں کا کام ہے۔ دماغ حرکت میں آتا ہے۔ جسم حرکت میں آتا ہے۔ جیب حرکت میں آتی ہے۔ سب سے پہلے کتاب کو کسی نقاد کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ رسمِ اجراء ادا کرے کیونکہ ادبی دُنیا میں اس کا مقام بہتر ہے۔ وہاں کامیابی نہ ملی تو کسی بڑے آدمی کے ہاں پہنچے جنھیں ادب سے لگاؤ ہے۔ وہاں کسی نے منہ نہ لگایا تو اربابِ سیاست کے پاس پہنچے۔ انھیں اور کیا چاہیئے۔ ان کا نام ہوا انھیں اس سے غرض اُن کا کام ہوا اُنھیں اس سے غرض۔ ایک آدھ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کو خاص نمائندگی دی جاتی ہے۔ اس رسم میں سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ حاضرین کو رسمِ اجراء کے شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے اور ختم ہونے کے کچھ دیر بعد تک حاضر رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا علاج بھی سوچ لیا جاتا ہے۔ اعلیٰ قسم کے طعام حاضر رکھے جاتے ہیں۔ فوٹوگرافروں سے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ کتنی

تصاویر معقت پیش کی جاتی ہیں۔ کتنے رسالوں میں چھپتی ہیں۔ غرضیکہ ہر پہلو پر غور کیا جاتا ہے۔

لو بچو! اب تم رسم اجراء کو اپنی آنکھوں سے دیکھو۔ یہ فلم کی ریل مجھے ایک نئے شاعر نے دی تھی کہ میں تھیں دکھاؤں۔

تم ایک عالی شان عمارت دیکھ رہے ہو۔ جو بقعۂ نور بنی ہوئی ہے دونوں طرف لوگ پھولوں کے ہار اور گلدستے لیے کھڑے ہیں۔ سبھی اشتیاق سے کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ موٹر گاڑیاں، سکوٹر قطار در قطار کھڑے ہیں۔ لو یہ پھولوں سے سجی ہوئی ایک کار آرہی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ اس کار سے کوئی دولہا اترے گا۔ اس رسم کا دولہا تو ہاتھ باندھے ہوئے بار بار لوگوں کے پاس سے گزرتا ہے اور مارا مارا پھر رہا ہے۔ غور سے دیکھو شاعر صاحب گاڑی کی طرف لپکے اور فوٹو گرافروں کو اشارہ کیا۔ کار کا دروازہ شاعر صاحب نے سلیقے سے کھولا اور عجز و انکسار سے جھکے۔ یہ کار سے اترنے والے شہر کے نامی گرامی رئیس ہیں۔ فیتے کاٹنا انھوں نے کسی سے نہیں سیکھا۔ یہ تو ان کا خاندانی پیشہ ہے۔ شاعر صاحب رئیس صاحب کے ساتھ چپکے چپکے چلے جا رہے ہیں اور فوٹو گرافر چٹاخ اور ترٹاخ سے فوٹو اتار رہے ہیں۔

اب یہ جو بڑا کمرہ تم دیکھ رہے ہو اور اس میں جو عالی شان سامان پڑا ہے۔ یہ سب سامان شاعر صاحب کرائے پر لائے ہیں۔ اور یہی وہ کمرہ ہے، جہاں یہ رسم ادا ہوگی۔ لو مہمانِ خصوصی تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کے پاس صاحبِ کتاب بھی تشریف فرما ہوئے۔ بچو! تم دیکھ رہے ہو کہ ایک طرف ایک ہی قسم کی کتابوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے اور اس پر ایک عمدہ قسم کی جلد کی بندھی کتاب بھی پڑی ہے جس پر ایک عمدہ فیتہ پڑا ہوا ہے۔ بس یہی، وہ کتاب ہے جسے مہمانِ خصوصی شاعر صاحب کو پیش کریں گے۔ اب تم یہ ضرور پوچھوگے کہ شاعر صاحب کو ان کی اپنی کتاب پیش کرنا کیا معنی!

لیکن بچّو! یہ سوالات چھوڑدو۔ غور سے سامنے دیکھو۔ وہ مہمان خصوصی کی طرف سے کتاب پیش کی گئی۔ شاعر صاحب اُٹھے۔ ٹیلی ویژن حرکت میں آیا۔ کیمرے کے بلب چمکے۔ لوگوں نے تالیاں پیٹنی شروع کر دیں۔ دیکھو آدھی کتاب مہمانِ خصوصی کے ہاتھ میں ہے اور آدھی شاعر صاحب کے ہاتھ میں۔ عین اس موقع پر شاعر صاحب نہایت انکساری اور کنکھیوں سے فوٹو گرافروں کو اشارہ کر رہے ہیں۔ بچّو! یہی وہ وقت ہے جس کا شاعر صاحب کو انتظار تھا۔ لیجیے اب شاعر صاحب کو کلام سُنانے کی دعوت دی گئی ہے۔

بچّو۔۔۔! کلام تو تم نے پڑھا ہوگا کیونکہ وہ مختلف رسالوں میں بار بار چھپ چکا ہے۔ اب سُن بھی لو۔۔۔ لو رسمِ اجراء ختم ہوئی۔ اب تم ایک اور کمرے میں پہنچو گے، جہاں انواع واقسام کے کھانے میزوں پر سلیقے سے چنے ہیں۔ یہ کیا۔۔۔؟ مہمان کھانے کی میزوں پر ٹوٹ پڑے۔ بچّو! یہ نظارہ تمھیں نہیں دکھایا جائے گا۔۔۔ رسمِ اجراء کی چھٹی ہوئی۔ اور اس کے ساتھ تمھیں بھی چھٹی۔۔۔!

مہمان

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں ؟ . . . میرا نام جیتندر ہے ۔"

"ضرور، ضرور آئیے . . . بیٹھئے کب آنا ہوا اور کیسے ۔"

"جی ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں - آہی رہا ہوں ۔"

"عزیز! بہت مدت کے بعد آئے ہو، کبھی کبھی بلا کام کے بھی آجایا کرو - تمھارا اگھر ہے - بیٹھ جاؤ، اچھا یہ بتاؤ یہ ٹوکری جو اپنے ساتھ لائے ہو، کیسی ہے ؟"

"چچا جان! بچوں کے لیے پھل لایا ہوں ۔"

"دیکھو برخوردار یہ تکلیف نہ کیا کرو - یہاں کس چیز کی کمی ہے - ارے

اور بملا کی ماں دیکھ کون آیا ہے۔"

"آتی ہوں، بچّوں کو تیّار کر دوں۔ ابھی آئی۔"

"ارے جیتیندر تو ہے۔ تو تو کافی بڑا ہو گیا رے۔ ۔ ۔ کب آیا۔ اور گھر میں سب خیریّت تو ہے۔ پچھلے دنوں تمھارا بھائی راجیندر بھی آیا تھا۔ گھر میں بہت رونق رہی۔ دو دن بعد ہی واپس چلا گیا۔ گھر میں بچّوں کے ساتھ گھُل مِل گیا تھا۔ بچّے اس کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اور ہم بھی۔"

" ہاں بھیّا بچّوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ پھر ہمارے گھر میں بھی ان کا یہی حال ہے۔"

" اچھا بملا کی ماں یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو جائیں گی۔ پہلے مہمان کے لیے کھانے پینے کا انتظام کرو۔ ہاں عزیز پہلے یہ بتاؤ کیا پیو گے؟"

"اجی۔"

" ہاں ہاں کہیئے۔ اس میں جھجکنے کی بات ہی کیا ہے۔ پھلوں کا رس لوگے تو بتاؤ کون سے پھل پسند ہیں۔ سوڈا لیمن لوگے۔ شربت کی خواہش ہے تو کون سا شربت پسند ہے اور سکنجبیں، غرضیکہ جو ٹھنڈی چیز پینا چاہتے ہو، بتاؤ۔"

"اجی۔"

" ہاں ہاں کہیے۔ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ اگر گرم پینے کی خواہش ہے تو بتاؤ کیا لوگے۔ چائے، پھر یہ بھی بتاؤ کہ چائے کون سی پسند ہے۔ اگر کافی پینے کا منشا ہے تو بتائیے۔"

" اجی۔"

" ہاں میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ اگر تمھیں دہی کی لسّی پسند ہے تو وہ فوراً انتظام ہو سکتا ہے۔ قریب میں حلوائی کی دکان ہے۔ سارے

شہر میں اِس سے بڑھیا دہی کوئی مہیا نہیں کرتا۔ اور بھئی ہمارے گھر میں تو بچہ ہو یا بوڑھا پیلے کھٹے لسی پیتے ہیں۔ ہاضمے کے لیے بہت مفید ہے۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ اب تمہارا دل کھٹی لسی پینے کو چاہتا ہے تو بتاؤ وہ تو گھر میں ہر وقت رکھی رہتی ہے۔ مہمانوں کا کیا پتہ، کب آجائیں ۔ ۔ ۔ اچھا ذرا جلدی بتائیے اتنی دیر میں تو تم نے فیصلہ کر لیا ہوگا۔"

"اجی، فی الحال کھٹی لسی ہی منگوالیں۔"

"بہت خوب! جو تمہاری پسند ۔ ۔ ۔ اب یہ بھی بتا دیں کہ کانچ کے گلاس میں تو پینے میں کوئی پرہیز نہیں۔ ہمیں تو ایسے گلاسوں سے سخت پرہیز ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے گلاس منگوا رکھتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی مہمان نوازی ہے۔ ہم تو پیتل کے بڑے بڑے گلاسوں میں ہی پیتے ہیں۔ ایک ہی وقت میں پیٹ بھر جاتا ہے۔"

"اجی۔ میں بھی ایسے ہی گلاس میں پی لوں گا۔"

"بہت خوب ۔ ۔ ۔ اری بلا کی ماں! جا اور جلدی سے ایک لڑکے کو بھیج دے۔ وہ بڑا گلاس قلعی کرا لائے۔ مہمان کے سامنے گلاس رکھا جائے تو چمکتا دمکتا تو ہو۔ کانچ کے گلاس میں یہ خوبی تو ہے کہ محنت کم ہوتی ہے اور خرچ بھی بچتا ہے۔ لیکن ہمیں خرچ کی اتنی پرواہ نہیں۔ اچھا ذرا جلدی بھیجنا۔ اتنے میں ہم کچھ باتیں کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ہاں عزیز کوئی گھر کی بات سُناؤ۔ تمہارے بھائی راجیندر کی طبیعت ہمیں بہت پسند ہے۔ تمہاری طبیعت کا تو پتہ لگے گا۔ وہ پچھلے دنوں یہاں آیا تھا۔ شام کو سب بچوں کو ہمراہ لے جاتا۔ کسی کو کھلونے، کسی کو مٹھائی۔ جس نے جو چاہا لیا۔ اور جاتے وقت بھئی کیا بتاؤں، ہر بچے کو پانچ پانچ روپے دینے لگا۔ اب گھر میں گیارہ بچے رہے۔ میں نے مجبور ہو کر کہا۔ زبردستی نہ کیجیے۔ دو دو روپیہ بہت رہیں گے۔ بھلا وہ کب ماننے والا تھا۔ پانچ پانچ ہی دے کر

گیا۔ دیکھو عزیز تم ایسی ضد نہ کرنا۔ دو دو رُوپیہ بہت ہوتے ہیں۔"

"اجی بزرگوار! یہ آپ نے کیا کہا دو رُوپے۔ نئی زمانہ دو رُوپے کیا ہوتے ہیں۔ راجیندر بھائی کو چاہیئے تھا کہ کم از کم دس دس رُوپے دے کر جاتے۔"

"کیا کہا دس دس روپیہ . . . ارے او بملا کی ماں۔ گلاس قلعی ہوکر آگیا ہے کیا؟"

"ابھی لڑکا گیا ہی کہاں ہے۔ کم بخت کو جُوتے ہی نہیں ملتے۔ بارہا کہاں ہے۔ ہر ایک کو دو دو تین تین جوڑے لے دو۔ لیکن آپ سنتے کِس کی ہیں۔ میں ابھی تلاش کیے دیتی ہوں۔"

"اچھا دیکھو۔ قلعی کے لیے بچّے کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ناشتے کے لیے دہی منگوالو۔ آلوؤں کے پراٹھے تل لو۔ باقی تم سب جانتی ہو۔ کیوں جیتندر ٹھیک رہے گا؟"

"جی بالکل جیسے آپ کا منشاء مبارک۔ دیکھیے، میں نے تو کسی بات پر اعتراض کیا ہی نہیں۔

"اچھا عزیز یہ بتاؤ آجکل کیا کرتے ہو۔ ایم، اے تو شاید تم نے کرلیا ہوگا۔"

"ہاں چچا جان! اسی سال ایم، اے سائیکلوجی میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا ہوں۔ اب لیفٹیننٹ بننے کا ارادہ ہے۔ اس سلسلے میں آج میرا پہلا انٹرویو ہے اور اسی لیے یہاں آیا ہوں۔"

"بھئی واہ کمال کررہے ہو۔ ہماری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں لیکن کیا تمھارے والدین نے اجازت دے دی؟"

"جی ہاں۔ میری والدہ تو بہت مدّت سے یہ خواب دیکھ رہی ہیں کہ میں فوج میں افسر بنوں۔ گھر میں تو آج تک سب ہی اپنی خدمت کرتے رہے۔ ملک

کی خدمت کرنے کا موقع تو پہلی بار ملے گا۔ میں نے انٹرویو کے لیے بہت تیاری کی ہے۔"

"عزیز یہ خبر بہت مسرت انگیز ہے۔ اچھا ناشتہ تیار ہو گیا ہے۔ آئیے!"

"چچا جان یہ ناشتہ تیار کیا ہے یا پورا کھانا . . . اچھا میں نے ناشتہ کر لیا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ ایک بجے کھانا کھانے کے لیے آؤں گا۔"

"اری بملا کی ماں، دیکھا اور سُنا تم نے۔ یہ جیتندر بہت دل والا لڑکا ہے۔ اس سے ہم بہت فائدہ اُٹھائیں گے۔ دوپہر کا کھانا بہت عمدہ بنانا۔"

"آ گئے عزیز! اچھا پہلے انٹرویو کی بات سُناؤ۔"

"ابھی میرا انٹرویو نہیں ہوا۔ غالباً چار بجے ہو گا۔ لڑکے بہت آئے ہیں۔"

"عزیز گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم ضرور کامیاب ہو گے۔ اچھا اب کھانا کھاؤ۔"

"یہ کیا چچا جان! آپ نے تو دُنیا بھر کے لوازمات اکٹھے کر رکھے ہیں۔ یہ سوندھی سوندھی خوشبو دماغ کو تر و تازہ کر رہی ہے۔ آپ نے بہت تکلیف فرمائی ہے۔"

"عزیز تم کو معلوم ہے کہ تمھاری چچی تم سے کتنا پیار کرتی ہے۔"

"اچھا میں نے کھانا کھا لیا ہے۔ اب میں شام کے پانچ بجے لوٹوں گا۔"

"عزیز وقت کی پابندی کا خیال رکھنا۔"

"بابوجی، جی بابوجی۔"

"کون ہے؟"

"جی مجھے جیتندر جی نے بھیجا ہے۔ ان کا ایک پیغام ہے۔"

"اندر آجاؤ۔"

"جی بابوجی۔ ۔ ۔ جیتندر جی نے کہا تھا کہ ان کا انٹرویو دو بجے ہو گیا تھا اور وہ کامیاب رہے۔ وہ اس کامیابی کو اپنے والدین کو بتانے کے لیے فوراً ہی چلے گئے۔"

"اچھا تم جاؤ۔"

"اری او بملا کی ماں! یہ جیتندر تو ہمارا بھی استاد نکلا۔"

اُعَداد سے مُلاقات

سب سے پہلے عدد وجود میں آیا۔ وہ تھا ایک۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے ہرگز ملاقات نہیں کر سکتے اس لیے عدد ایک سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ ویسے بھی اکیلے دُکیلے کا اللہ بیلی سمجھ کر چلیے اور عدد دو سے ملاقات کیجیے۔

عدد دو سے ملنے سے پہلے میری دو باتیں سُن لیجیے۔ عدد دو نے بہت کار ہائے نمایاں کیے ہیں۔ یہ دونوں جہاں دو کی بدولت ہی قایم ہوئے ہیں۔ اگر آپ دُنیا میں تشریف لاتے وقت اللہ کے گھر سے چاندی کا چمچہ چُرا کر اور مُنہ میں چھپا کر لائے ہیں تو آپ کا دُنیا میں تشریف لانا مبارک۔ ورنہ لوٹ جائیے کیونکہ آپ کو عمر بھر دو آتشہ پینے کو تو کیا دیکھنے کو بھی نہیں ملے گی۔ آپ نے سُنا

ہوگا، ہم دو ہمارے دو۔ دو ملّاؤں میں مرغی حرام۔ دو تلواریں ایک میان میں نہیں رہ سکتیں۔ دو عورتوں کو اکٹھا کر دیں، پھر دیکھیں دو کے نظارے دو سانڈوں کو ایک جگہ لائیے پھر دیکھیے دو کے کارنامے ——— پیار ہو تو دو ہیں، جھگڑا ہو تو دو ہیں۔ عاشق اور معشوق دو۔ ایک ناز آفرینی کے لیے دوسرا ناز برداری کے لیے۔ اجی تالی تک دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ بھوکے کو کیا چاہیے، دو روٹیاں، چار مانگے تو انکار کر دیں۔ کیونکہ اس کی بھوک کا مٹنا دو روٹیوں سے ہی ضروری ہے۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ . . آپ سیر کرنا چاہیں، سنیما جانے کا خیال آئے، سفر پر جانا پڑے۔ فوراً دوسرے ساتھی کو حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔ آپ کے کھانے میں ایک سبزی دھری ہے آپ فوراً کہیں گے کم از کم دو تو ہوتیں ——— اب یاد کیجیے وہ زمانہ جب مدرس آپ کو دونوں کانوں سے پکڑ کر سزا دیتا تھا۔ یا آپ دونوں کان خود پکڑتے تھے۔ سزا سے بچنے کے لیے یا سزا کے طور پر۔ چوراہے پر سپاہی دو ہاتھوں سے اشارے کرتا ہے۔ تبھی گاڑیاں ٹکرانے سے بچتی ہیں۔ حال وقال دو ——— اس سے پہلے کہ پھانسی لینے یا دینے کا خیال آئے۔ دو چیزیں تختہ اور رسّی کا انتظام ہونا ضروری ہے۔ اس دو سے دو دو ہاتھ ہو چکے۔ چلیے عدد تین سے ملاقات کیجیے۔

عدد تین مختلف کیفیتیں رکھتا ہے۔ ہندوؤں میں برہما، وشنو، مہیش تین، مسلمانوں میں خدا، رسول، قرآن، تین عیسائیوں میں خدا، مسیح اور روح القدس تین۔ شیوجی کی تیسری آنکھ کھلی اور تانڈو نرتیہ شروع ہوا۔ کل کائنات متکلم، حاضر غائب تین پر مبنی ہے۔ فرشتہ، انسان اور شیطان تین اہلِ تصوف کے مسلکے ——— شریعت، طریقت اور معرفت تین۔ وضو میں ہاتھ دھوتے ہیں تو تین مرتبہ۔ طلاق کا لفظ تین بار دہرانے سے طلاق ہوتا ہے انسانی حیات طفلی، شباب، کہولت تین پر مبنی۔ عاشق، معشوق اور رقیب تین۔ دنیا میں سب جھگڑوں کے بانی زر، زن، زمین تین۔ تکوین تین کی۔ آسمان،

زمین اور پاتال تین - آدم، حوّا اور ان کی اولاد تین - خشکی، تری، ہوا تین، آپ چوسر کھیلیے اور یہی دعا کریں گے کہ تین کانے نہ پڑیں - تاش میں تین تیے ٹھیک پڑنے کی دعا ہوگی - کرکٹ کھیلنا ضروری ہو تو تین ڈنڈے لائیے ورنہ بھاگ جائیے - آپ کی باتوں میں کسی نے دخل دیا تو آپ کہیں گے . . . " صاحب آپ تین میں نہ تیرہ میں . . " کہیں تین پانچ ہوگئی تو معاملہ عدالت میں پہنچ سکتا ہے - پنجابی کی کہاوت ہے . . . " تیجا ریا گھر گلیا . . " مُردے کو قبر میں لٹا کر کہیں گے - مُردہ پر تین دن بھاری رہیں گے - دعوت کیجیے تو تین کو نہ بلائیے - ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ بات ہو کہ " تین بلائے تیرہ آئے، دے دال میں پانی " - دال میں پانی ڈالنے سے نہ دال کا مزہ آئے گا نہ پانی کا - وہ بات بھی ہو سکتی ہے کہ تین جیاتی نو براتی - تین کو بلانا ہی ہو تو سہ آتشہ کا انتظام کیجیے —— مہاتما گاندھی کے بندر تین، ان کی نصیحتیں بھی تین - دو کے جھگڑے میں ثالثی تیسرا - عالمگیر لڑائی کے موجد تین اور ٹکر لینے والے تین - خلا میں جانے والے خلاباز تین —— اجی وہی ڈھاک کے تین پات . . . چھوڑیے اور بھیجیے تین حرف اس تین پر جس نے میرا اور آپ کا ناک میں دم کر رکھا ہے -

اور چلیے عدد چار سے ملاقات کرنے - لیکن پہلے اطمینان کر لیجیے کہ آپ کے بچے تین سے زیادہ تو نہیں -

عدد چار قابلِ ستائش ہے —— وید ہیں تو چار - حضرت محمدؐ صاحب کے یار چار —— خاک، باد، آب اور آتش عنصر چار - اخبار بینی، اخبار نگاری، اخبار رسانی، اور اخبار کشی چار - خداوند کریم سے جب بھی دعا مانگی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ قسمت کو چار چاند لگ جائیں - چاند تو ایک ہی ہے - باقی شاید اللہ میاں نے چھپا کر رکھے ہوئے ہیں - چاندنی صرف چار دن کی ہوتی ہے اور اس کے بعد اندھیری رات - چاندنی کے چار دنوں

میں کسی سے آنکھیں چار کیجیے اور زندگی کا لطف لیجیے ——— کسی کا ڈنکا بجتا ہے تو چار دانگ — گوشے چار، کونے چار، سمتیں چار، ملتان کی چیزیں چار ہی تو مشہور ہیں۔ گرد، گرما گدا و گورستان، فقیر کو انعام دیجیے، دعائیں کہے گا کہ آپ کی ترقی چوگنی ہو۔ اگر دوگنی کہے تو انعام چھین لو۔ چوکھٹے میں خوبصورت شیشہ لگائیے اور چوکھٹا دیکھیے۔ چار دوستوں کے ساتھ چوسر کھیلیے اور مزہ لیجیے۔ دنگل میں پہلوان وہی جو حریف کو چاروں شانے چت گرائے۔ دو شانوں سے چت گرانے سے کھیل کا فیصلہ نہیں ہوگا۔ چاہے شانے دو ہی ہوتے ہیں کسی کو زبردست مار پڑے تو لوگ کہیں گے چار چوروں کی مار پڑی۔ دو چوروں کی مار تو مار ہی نہیں ہوتی۔ بہت ہوشیار رہے تو لوگ کہیں گے چاروں گانٹھ ہوشیار ہے۔ چاروں گانٹھ کمیت ہے ——— اجی چار دن کی کوتوالی پھر وہی کھرپا وہی جالی ——— جہاں چار بھائی ہوں وہاں سے ٹل جائیے۔ کیونکہ آپ نے سنا ہوگا . . . چار بھیا ماریں دھون چھین لیں روپیہ . . .”۔ اگر آپ بے مروت ہیں تو آپ کو چار چشم کہا جائے گا۔ حالانکہ سبھی عینکیں لگانے والے چار چشم کہے جاتے ہیں اور آپ کی دو چشم بھی پوری نہیں۔ مجرم معمولی ہو یا خطرناک رکھا جاتا ہے چار دیواری میں ——— بھوجن، بھجن، خزانہ، ناری، ان چاروں کو پردے میں رکھیے۔ سواری کا مزہ جب، جب گاڑی چار پہیوں کی ہو ——— اور صاحب بلا چارپائی کے بھی کبھی نیند کا مزہ آتا ہے مفید جانور بھی چار پائے ہوں گے ——— حادثے ہوتے ہیں تو چوراہوں پر۔ پولیس تعینات ہوتی ہے تو چوراہوں پر ——— بھولے بھٹکے مسافروں کو رستے دکھاتے ہیں تو چوراہے ——— دشمن پر حملے ہوتے ہیں تو چاروں طرف سے ——— اور کیوں صاحب میرے اس مضمون پر رائے زنی کیا چاروں طرف سے نہیں ہو رہی ——— بھلے برے میں فرق ہے تو چار انگلی کا۔ حالانکہ انگلیاں پانچ ہوتی ہیں۔ درویشوں کی بات کیجیے، قصہ چہار درویش پر ختم ہوگی۔ آپ

اگر چوبے ہیں تو چوبے ہی رہیے۔ گئے تو دوبے ہو کر واپس آؤ گے۔ صاحب چار دن کی زندگی ہے۔ چار کام تو اچھے کرتے جائیے۔ اس سے پیشتر کہ آپ کا آخری سفر چار کے کندھوں پر طے ہو، عدد پانچ سے ملاقات کرتے جائیے۔

عدد پانچ کے ملنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ ہم بھی ہیں پانچوں شہسواروں میں ——— اور یہ بھی سن لیں کہ ہم پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ڈال کے آئے ہیں ——— عدد پانچ کا تین سے گہرا رشتہ ہے۔ اس لیے آپ ان سے تین پانچ نہ کریں۔ پنچ پرمیشور، پنچ کنیائیں، پنج دریا، پنج اندریاں، پنچ تت، پنجتن کون نہیں جانتا۔ ابجی پنچوں کا کہنا سر ماتھے پر ——— پنجہ صاحب دیکھیے۔ ناگ پنچمی کی پوجا کیجیے اور سیدھے عدد چھ کے پاس چلے چلیے۔

عدد چھ سے ملاقات کا خیال آتے ہی وہ کھٹ رس بھوجن یاد آگیا جو چھ سال پہلے ملا تھا۔ اور جس کے کھلانے والوں نے چھ سال کے بعد دوبارہ کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اجی کھانے والے بھی چھ تھے اور کھلانے والے بھی چھ ——— چھ راگ ملیں تو کھٹ راگ بنتا ہے۔ راگوں سے تنگ آ گئے تو آپ کہیں گے کیا کھٹ راگ لگا رکھا ہے۔ درشن چھ، شاستر چھ، بھونرے کے پاؤں چھ، مکڑی کی ٹانگیں چھ، سوامی کارتکیے کے منہ چھ ——— دائیں، بائیں، اوپر، نیچے، آگے، پیچھے، سمتیں چھ، سچ بتائیے کہ کیا آپ کو کبھی چھٹی کا دودھ یاد آیا۔ اچھا یاد کیجیے اور فی الحال عدد سات سے ملیے۔

عدد سات کے پاس پہنچنے سے پہلے نئی بیوی سے سات پھیرے لیجیے۔ سات رشیوں کو ملیے۔ ۔ ۔ سات سیاروں سے ملیے۔ ۔ ۔ سات سُر سنیے۔ ۔ ۔ دُنیا کے سات عجوبے دیکھیے۔ ۔ ۔ میرے سات مضامین سنیے۔

اور ہفت اقلیم کی بادشاہت مانگیے ۔ ۔ ۔ سات رنگوں کی قوس قزح دیکھیے ۔ سات سمندروں کا پانی پیجیے ۔ ۔ ۔ مسلمانوں کے سات آسمان دیکھیے ۔ چھ دن کے بعد ساتواں دن اتوار کا نصیب ہوتا ہے ۔ پکنک پر جائیے ۔ سات ساتھی جائیے ۔ مزہ سات گنا آئے گا ۔ ۔ ۔ اور پھر واپسی پر عدد آٹھ سے ملاقات کرتے جائیے ۔

عدد آٹھ سے ملیے ۔ سنا ہے آپ نے آٹھ جلا ہے نو حقّے اس پر بھی ٹھکم ٹھکّے ۔ زمین کے کونے آٹھ ۔ ۔ ۔ محافظ آٹھ، بر آٹھ، گرہ آٹھ، یوگ آٹھ، ۔ ۔ دھات آٹھ ۔ ۔ ۔ اشٹ لکشمی ۔ اشٹ ناٹکم سے مل کر عدد نو کی بات سننے سے پہلے اشٹمی کی پوجا کر لیجیے ۔

عدد نو فرماتے ہیں کہ نو نقد اچھے نہ تیرہ ادھار ـــــــ نو گزی قبر پر فاتحہ پڑھیے اور دعا کیجیے کہ آپ کی قبر بھی نو گز کی ہو ـــــــ آپ نو ماہ کا سفر کر کے دنیا میں تشریف لائے ہیں ۔ اب نو ماہ آرام کیجیے ۔ نو دن چلے اڑھائی کوس ۔ نو من تیل کا انتظام کر لیں ورنہ رادھا نہیں ناچے گی ۔ نو گرہوں اور نومی کی پوجا کیجیے ۔ عدد دس سے ملنے سے پہلے محتاط ہو جائیے ۔

عدد دس ۔ آپ دس نمبرے ہیں ۔ بیتہ نمبر دس پر پولیس کے دس آدمی ہر وقت پہرہ دیتے ہیں ۔ آپ سے پولیس ڈرتی ہے ۔ منصف ڈرتا ہے، جیلر ڈرتا ہے، دنیا ڈرتی ہے ۔ اگر آپ بدزبان ہیں تو آپ کی زبان دس گز کی یا دس ہاتھ کی ہوگی ۔ ناپ کر اطمینان کر لیجیے ۔ راکھشسوں میں سب سے بڑا راکھشس تھا راون اور اس کے سر تھے دس ۔ اسے مارا بھی دسویں کے دن ہی جا سکا تھا ۔ یہ بات دسوں دشاؤں میں پھیلی ہوئی ہے ۔ یہ کیا ؟ آپ ڈر کیوں رہے ہیں ۔ اچھا اب آپ گھر جائیے اور اللہ تعالیٰ کا دس بار نام لیجیے ۔

قواعدِ محفلِ طنز و مزاح

اس محفل کا نام محفلِ طنز و مزاح ہوگا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر دنیا کے کسی علاقے میں ہو سکتا ہے۔ خالقِ طنز و مزاح اس کے دائمی سرپرست ہوں گے صدر، نائب صدر، سکریٹری، خزانچی ہر ماہ چُنے جایا کریں گے۔

اس محفل میں زبان پر یا زبان کی کوئی قید نہیں ہوگی۔

اس محفل کو رجسٹرڈ نہیں کرایا جائے گا۔ نہ کسی شخص کو اس نام کی محفل بنانے کی اجازت ہوگی۔ اگر کوئی شخص ایسی حرکت یا جرأت کرے گا تو اسے مذاق سمجھ کر درگزر کر دیا جائے گا۔

اس محفل کا کوئی چندہ نہیں ہوگا۔ اگر کوئی شخص کوئی بھاری رقم بہ طور عطیہ دے گا تو اسے منظور کیا جائے گا لیکن اس کا شکریہ ادا نہیں کیا جائے گا۔

اس محفل کا ہر ذی ہوش ممبر ہو سکتا ہے۔ ایسے انسانوں کو جو ابھی پیدا نہیں ہوئے یا پیدائش کے لیے تیاری کر رہے ہیں یا پیدائش کو لات مار کر چلے گئے ہیں ترجیح دی جائے گی۔

ہاتھ کے سخی، دل کے نرم، کان کے کچے، دُھن کے پکے اس محفل کی جان ہوں گے۔

اس وقت انسان دُنیا میں روتا آتا ہے، روتا جاتا ہے۔ اس محفل کا کام نظامِ قدرت میں تبدیلی لانا ہوگا۔ پھر انسان ہنستا آئے گا، اور ہنستا جائے گا۔

اس محفل کی ماہانہ نشستیں ہوں گی۔ ہر امیر، کبیر، غریب فقیر، اپنے گھر محفل منعقد کرا سکتا ہے جس کے لیے درخواست دینی ہوگی۔ درخواست دینے والا اگر مرد ہے تو اپنی بیوی کے بھی دستخط کرائے گا۔ اور اگر عورت ہے تو اپنے مَرد کے بھی دستخط کرائے گی۔ کنواروں کو ترجیح دی جائے گی۔

ماہانہ محفلیں مختلف قبرستانوں میں بھی منعقد ہوں گی۔ تاکہ مُردے بھی محفل کی کارروائی سے لطف اندوز ہو سکیں۔

محفل میں محض نئی بات اور نیا کلام سُنایا جائے گا۔

اپنا نام اُچھالنے اور دُوسروں کی پگڑی اُچھالنے کی اجازت ہوگی۔

جس طرح دنگلوں میں پہلوان لڑتے ہیں۔ اُسی طرح شاعروں کو شاعروں سے لڑایا جائے گا۔ جس طرح پہلوانوں کو جنگ و جدل سے بچانے کے لیے ایک اور پہلوان حاضر رہتا ہے۔ اسی طرح شاعروں کو جنگ و جدل سے بچانے کے لیے کسی پہلوان شاعر کو حاضر رکھا جائے گا۔

اس محفل کا سالانہ اجلاس ہوگا۔ اس میں دُنیا بھر کے طنز و مزاح نگار بلائے جایا کریں گے۔ جو طنز و مزاح نگار اس دُنیا کو چھوڑ گئے ہیں، ان کو خالقِ طنز و مزاح کی معرفت دعوت نامے بھیجے جائیں گے۔ بہشت اور دوزخ سے آنے والے حضرات کے لیے رہائش اور خوراک کا انتظام کیا جائے گا۔ . . البتہ بستر ان کو

ہمراہ لانا ہوگا۔

سالانہ اجلاس میں خطبۂ صدارت لکھا ہوا یا لکھوایا ہوا نہیں پڑھا جائے گا بلکہ صاحبِ صدر زبانی پیش کریں گے۔ سکریٹری محفلِ طنز و مزاح ان کارہائے نمایاں پر روشنی ڈالیں گے جو سرانجام نہیں پائے۔ اس اجلاس میں فی البدیہہ شعر کہنے والوں کے گلے میں طوق فی البدیہہ پہنایا جائے گا۔ اجلاس کے اختتام سے پہلے محفلِ قہقہہ منعقد ہوگی۔ جس میں سب سے اونچا اور سب سے لمبا قہقہہ لگانے والوں کو اعزازی قہقہہ چکر دیا جائے گا۔ یہ چکر بلا لحاظ مذہب و ملت، ملک و قوم رنگ و نسل عطا ہوگا۔

حکومت سے درخواست کی جائے گی کہ قہقہہ چکر کو اشوک چکر یا گھن چکر کے برابر رتبہ دیا جائے اور اگر حکومت نہ مانے تو کوئی اندولن نہیں کیا جائے گا۔

اس محفل کی شاخیں دُنیا کے گوشے گوشے میں قائم کی جائیں گی۔

اس محفل کا اپنا نگر قایم کیا جائے گا جس کا نام تمسخر نگر ہوگا اس نگر میں سب سے بڑا پلاٹ اس کو الاٹ ہوگا جو سب سے بڑا تمسخر پیش کرے گا۔ اس نگر کا پہلا پتھر خالقِ طنز و مزاح اپنے دستِ مبارک سے رکھیں گے۔ محفلِ طنز و مزاح کا دفتر تمسخر نگر کے عین درمیان ہوگا۔ اس کی نقاب کشائی کی رسمِ خالق طنز و مزاح نقاب پہن کر کریں گے۔

اس نگر میں رونے، چیخنے یا چلانے کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس نگر میں ہنسی، تمسخر سکھانے کے اسکول کھولے جائیں گے۔ حاضر جوابی میں طاق، برجستہ گوئی میں مشاق، آوارہ گردی میں شہرۂ آفاق، لطیفہ گوئی میں استاد، فطانت و ذہانت کے مجسمے، شوخی و بذلہ سنجی کے مرقعے۔ حکمت میں ارسطوئے ثانی اور مصوری میں رشکِ بہزاد و مانی، استاد رکھے جائیں گے۔ قدرت نے جانوروں کو ہنسنا نہیں سکھایا۔ یہاں جانوروں کو بھی ہنسنا سکھایا جائے گا۔ اور اس معاملے میں انسانوں اور حیوانوں کی تمیز مٹا دی

جائے گی۔

اس محفل کا اپنا کتب خانہ ہوگا جس کا نام تخانۂ تبسم ہوگا۔ اس کتب خانے میں دُنیا کے تمام طنز اور مزاح نگاروں کا لٹریچر ہوگا۔ ان کی قدِ آدم تصاویر لگائی جائیں گی۔ کتب خانے میں مسکرانے، ہنسنے، قہقہہ لگانے کی اجازت ہوگی۔

اس محفل کی ایک کینٹین ہوگی جو ہر وقت کھلی رہے گی۔ اس میں تخم خوش مذاقی، برگ خندہ پیشانی، گلِ زندہ دلی، مسکراہٹ کے بیج...؛ چہچہاہٹ کی شاخیں، قہقہوں کی پھانکیں، ہنسی کے گول گپے، مذاق کے لمچے مفت میں ملیں گے۔ اپنی پسند کا کھانا بنانے والوں کو تفریح کی کڑھائی، ظرافت کا چولھا۔ دل لگی کی دیگ، مجنوں کی پسلیوں کے قد کی لکڑیاں، لیلیٰ کی چھوٹی اُنگلی کے قد اور حجم کا فتیلہ اور چھیڑ چھاڑ کی دیا سلائی مفت ملے گی۔ فصاحت کی دھونکنی سے بلاغت کے شعلے بلند کرنے کی اجازت ہوگی۔ لیکن دھوئیں کو کینٹین سے باہر نکلنے نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ اسے برقرار رکھا جائے گا۔

اگر کوئی شخص اس محفل کا دانستہ یا نادانستہ مذاق اُڑائے گا تو اس کو محفل کی طرف سے تمغہ عنایت کیا جائے گا۔ شگفتہ مذاق کے لیے، تمغۂ مذاق شگفتہ اور بھونڈے مذاق کے لیے تمغۂ مذاقِ بے مزہ دیا جائے گا۔ یہ تمغہ بھی بلالحاظ مذہب وملت، ملک وقوم رنگ ونسل دیا جائے گا۔

اس محفل کا کام طنز، مزاح، ہجو، پھبتی، یاوہ گوئی، فقرے بازی، ضلع جگت، تمسخر، برجستہ گوئی، بذلہ سنجی، شوخی، حاضر جوابی، لطیفہ گوئی، آوازے کسنا، ہنسنا، سکھانا ہوگا۔

اس محفل کا آخری کام دُنیا میں مسکراہٹیں بکھیرنا، ہنسی پھیلانا،

قہقہے اُچھالنا، پیار اور محبت کے چشمے جاری کرنا، مریضوں کو امراض سے اور ڈاکٹر کو مریضوں سے، مقدمات کو وکیلوں سے اور وکیلوں کو مقدمات سے نجات دلانا ہے۔
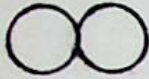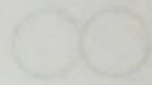
سُنَا ہے کہ اتنی بڑی دُنیا بنانے کا مسئلہ جب مالکِ کُل کے سامنے درپیش ہوا تو انھیں ایک ہلکا چکّر آیا۔ اس چکّر کی یاد میں انھوں نے اس دُنیا کا نام کرن کیا اور اس کا نام سنسار چکّر رکھ دیا۔ یہ بھی سُنا ہے کہ اس واقعہ کی یاد میں ارشاد صادر ہوا کہ زمین ہر وقت چکّر میں رہے گی اور ہر آنی جانی چیز چکّر کھایا کرے گی۔ یعنی جہاں آنی جانی چیزوں کو چکّر میں ڈال دیا۔ وہاں چکّر کو آنی جانی چیز بنا دیا۔ یہ چکّر کب آتا ہے اور کب جاتا ہے اس کا پتہ محض اس وقت لگتا ہے جب یہ آتا ہے اور جب یہ جاتا ہے۔ یہ کب آ جائے گا اور یہ کب تشریف لے جائے گا اس کا پتہ نہیں لگ سکتا کیونکہ چکّر کا آنا قدرتی ہے اور قدرت اپنا پتہ نہیں دیتی۔ بڑے بڑے ڈاکٹر اس چکّر میں ہیں کہ اگر اس چکّر کا مستقل علاج مِل جائے تو ان کے چکّر ختم ہوں۔

اسی چکر میں ان کو چکر چلے آرہے ہیں۔ لیکن چکر کا علاج نہیں ہوا۔ جب چکر کا مریض علاج سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ چکر کے خالق کے حضور میں دعا کرتا ہے لیکن چکر چلے آرہے ہیں۔ چل رہے ہیں، چلتے رہیں گے۔ قدرت کا نظام مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ جب تک مالکِ کل کو دُوسرا چکر نہیں آتا۔ یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ پہلا چکر کب آیا اور دُوسرا چکر کب آئے گا اور دُوسرا چکر آئے گا بھی یا نہیں۔ قدرت کو سمجھنا مشکل ہے۔ لیکن انسان اس کے سمجھنے کے چکر میں ہے۔ وہ رازِ قدرت کو پانے کے لیے سر بہ فلک چوٹیوں پر پہنچتا ہے۔ سمندروں کی تہوں میں جاتا ہے۔ گہرے غاروں میں گھستا ہے۔ چاند پر اُترتا ہے۔ خلاؤں کی خبر لاتا ہے لیکن چکر پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔

اس مختصر مضمون میں خدا کی ایک ایسی خلقت کا ذکر ہے جو زمین کی طرح ہر وقت تو چکر میں نہیں رہتی لیکن چکر کے معاملے میں اس کی پوزیشن نمبر دو پر ہے۔ میرا مطلب شاعر اور نثر نگار سے ہے۔ شاعر ہو یا نثر نگار دونوں کی منزل ایک ہے تخیل دونوں پر سوار ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ ایک کو وزن نے بھی دبا رکھا ہے جنھیں بات نظم میں پسند ہے وہ شاعر کو پسند کرتے ہیں۔ جو بات نثر میں پسند کرتے ہیں انھیں نثر نگار پسند ہیں۔ جنھیں بات نظم اور نثر دونوں میں پسند ہے وہ دونوں کو پسند کرتے ہیں۔ یہ پسند کرنے والے ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور چکر ان کو بھی آتے ہیں۔ سننے کے۔ شاعر ہو یا نثر نگار ——— ان کی زندگی کا انحصار ان کے مدّاحوں پر ہے۔ اور وہ اپنے مدّاح پیدا کرتے ہیں اور ان کے زندہ رہنے کی دعائیں کرتے ہیں اور پتہ رکھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔

شاعر کو پہلا چکر تب آتا ہے جب اسے یہ خیال آجائے کہ شعر کہا جائے اور اگر یہ خیال اس کا ہم خیال ہو جائے تو پھر چکر آنے شروع ہو جاتے ہیں اور چکروں کا مرض یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اور شاعر کو آخری چکر تب آتا ہے یا یوں کہیے کہ چکر آنا بند ہو جاتا ہے جب وہ شعر کہنے کے قابل نہیں رہتا۔ . . یہی حالت

نثر نگار کی ہے۔

شاعر کو اصلاح لینے کی ضرورت در پیش آتی ہے۔ اور وہ استاد ڈھونڈتا ہے۔ اس کے لیے اسے بہت چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اُسے گڑگڑانا پڑتا ہے . . . خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں۔ سر کے بل چلنا پڑتا ہے اور اگر وہ استاد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے تو سمجھیے کہ وہ چکر ویوہ میں داخل ہو گیا۔ جہاں سے بے دخل ہونا ناممکن ہے۔ اسے اب کبھی خاموش جگہ چاہیے جہاں موت کی سی خاموشی ہو اور کبھی ایسی جگہ جہاں شور ہو رہا ہو، جھرنوں کا، فوّاروں کا۔ کبھی اسے مرغزار چاہیے تو کبھی صحرا ——— کبھی وہ پرندوں کی چہچہاہٹ سُننا چاہتا ہے تو کبھی عقاب کی جھپٹ دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ کبھی ذبح خانوں میں کٹتے جانوروں کو دیکھنے جاتا ہے تو کبھی فسادات میں کٹتے انسانوں کو۔ وہ جیل خانوں میں قیدیوں سے اور پاگل خانوں میں پاگلوں سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے بہت بڑا کتب خانہ چاہیے جہاں وہ زمین ڈھونڈ سکے۔ اسے عمدہ قلم چاہیے جس سے وہ زمین ہموار کر سکے۔ اسے فکرِ معاش نہ ہو تاکہ وہ اپنا وقت اسی کام میں لگا سکے۔ اسے نیک بیوی چاہیے جو بغیر چون چرا کیے اس کی ہاں میں ہاں ملائے اسے اشعار کہنے میں نہ ٹوکے۔ اس سے کوئی چیز طلب نہ کرے۔ اس کی شاعری میں مدد کرے۔ بلکہ مشاعروں میں اس کے ساتھ جائے۔ اسے ایسے بچّے چاہئیں جو اس سے کچھ نہ مانگیں۔ اسے اطمینان بخش زندگی چاہیے تاکہ وہ دُنیا کو ایک غزل دے سکے۔ ایک طنز ایک مزاح دے سکے۔ ایک نظم دے سکے۔ ایک قصیدہ دے سکے ——— وہ دُنیا کو تنبیہہ کر سکے۔ اس کے خیال سے ریسرچ اسکالر خیالات کا جامع مرتّب کریں۔ وہ اپنے اشعار سے شعور دے سکے۔ ادب سے بے ادبی دُور کر سکے۔ اور اس چکر میں جس میں وہ پڑا ہے دُوسروں کو ڈال سکے۔ شاعر ہو یا نثر نگار . . . اسے اگر یہ چیزیں دستیاب نہ بھی ہوں تو بھی وہ ان کی پرواہ نہیں کرتا . . . بڑے دل گردہ کا ہے یہ انسان!

ہمارے مبتدی شاعر پہلی بار ایک مشاعرہ میں گئے۔ انھوں نے شعراء کی قدر افزائی دیکھی۔ سلامیں ٹکراتی دیکھیں۔ ان کا دل چٹکیاں لینے لگا۔ مشاعرہ کا دل پر گہرا اثر ہوا۔ سوچنے لگ پڑے۔ دیر سے واپس آئے تھے، نیند نے غلبہ کیا اور سو گئے۔ چند لمحوں کے بعد سوتے ہی میں بڑبڑانے لگے . . . "کیا خوب کہا ہے . . . مار ڈالا . . . پھر کہیئے . . ." بیوی گھبرا کر اٹھ بیٹھی، دیکھا تو مارنے والا اور کچھ کہنے والا کوئی نہیں تھا۔ میاں کے چہرے پر کبھی خوشی کے آثار نظر آتے تو کبھی مرجھائے دکھائی دیتے۔ بیوی سمجھ گئی۔ مشاعرہ کا چکر ہے۔ صبح تک ٹھیک ہو جائیں گے۔ دعائیں کیں۔ شاعر صاحب سو رہے تھے، بیوی پھر سو گئی۔ چند منٹ کے بعد پھر آواز آئی . . . "سنیئے قبلہ میں بھی ایک شعر بلکہ پہلا شعر عرض کرتا ہوں . . ." اس کے بعد پھر خاموشی ہو گئی۔ صبح اٹھے تو بیوی نے رات کی کیفیت بتائی اور اس پاگل پن سے باز رہنے کی درخواست کی۔ شاعر صاحب کو جب یہ پتہ لگا کہ انھوں نے سوتے ہیں شعر کہنے کی جسارت کی تھی اور وہ بھی بھری محفل میں . . . حالانکہ انھوں نے کبھی شعر نہیں کہا تھا، تو ان کی باچھیں کھل گئیں اور انھیں یقین ہو گیا کہ وہ شاعری کی دنیا میں قدم رکھ چکے ہیں۔

غسل کیا اور تازہ دم ہوئے۔ شعر لکھنے کے لیے کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے۔ اور بیوی کو ہدایت کی کہ جلدی چائے تیار کر کے لائے۔ تاکہ وہ اطمینان سے اشعار لکھ سکیں۔ بیوی نے چائے میز پر رکھ دی۔ شاعر صاحب اپنے خیال میں مست گنگنا رہے تھے۔ انگلیاں چل رہی تھیں، دماغ چل رہا تھا، سر گھوم رہا تھا۔ پاؤں ہل رہے تھے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ ایک بچہ ان کے پاس پہنچا تو جھڑک کر نکال دیا۔ کاغذ پر کافی کچھ لکھ دیا گیا تھا۔ لیکن وہ قلم زد بھی کر دیا گیا تھا۔ بیوی وقت پر کھانا لے کر آئی تو دیکھا چائے اسی طرح پڑی ہے . . . سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کا چکر ختم ہوا تو طوعاً و کرہاً میاں کو کام پر بھیجا۔

میاں چلے جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے خیالات کی پریڈ بھی ہوئی لڑی چل رہی تھی، اچانک کھمبے سے ٹکرا گئے۔ اور چکر کھا کر گر پڑے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے باتیں بنانے لگے ——— کسی نے کہا۔ . " کمزوری کی وجہ ہے . . " کسی نے کہا۔ . " دیکھنے میں تو ہٹا کٹا ہے مرگی کا مریض ہو گا . . " اتنے میں شاعر صاحب کے منہ سے نکلا . . . " کیا مصرعِ طرح ہوا ہے . . " تب لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ شاعری کا چکر ہے۔

کسی نے کہا . . " جناب یہ مرض لاعلاج ہے . . "

کسی نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ اس موذی مرض سے مریض کو نجات ملے۔

شاعر صاحب شام کو گھر تشریف لائے تو ان کے ساتھ کچھ نئے ملاقاتی بھی تھے۔ جنھوں نے شاعر صاحب کو بتا دیا تھا کہ اچھا شعر جب بنتا ہے جب دماغ بادۂ ناب سے سرشار ہوتا ہے ——— شاعر صاحب اب خوب پیتے ہیں، خوب پلاتے ہیں۔ ان کے چکروں میں اضافہ ہو گیا ہے جو شاعری اور شراب نے مل کر کیا ہے۔

چند دن ہوئے میں اُن سے ملا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بے نیاز فرمانے لگے . . . " کہ وہ چاہتے ہیں دنیا کو غزلوں کے دیوان دے جائیں، نظموں کے ذخیرے بخش جائیں، قصیدوں کے انبار چھوڑ جائیں۔ ان لوگوں کے لیے بھی مرثیے کہے جائیں جو ابھی فوت نہیں ہوئے۔ وہ ایسا مزاح پیش کرنا چاہتے ہیں جسے سُن کر لوگ مزاح نگاروں کو بھول جائیں۔ وہ اتنا بڑا طنز کرنا چاہتے ہیں جو عوام کی سمجھ سے باہر ہو۔ وہ دنیا کو تنبیہہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چکر کھانے والی کرسی پر بیٹھے چکر لیتے رہے اور چکر کھاتے رہے۔ ان کی باتیں سُن کر مجھے بھی ایک چکر آیا۔

یہ چکر ہر شاعر اور ہر نثر نگار کو آتے ہیں۔ اور یہ جبھی ختم ہوتے

ہیں، جب یہ ختم ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ آپ شاعر بنیئے یا نثر نگار، یا دونوں بنیئے اور چکّروں کا مزہ لیجیے۔ چکّر کا مزہ کھانے سے آتا ہے بتانے سے نہیں۔

خواتین کے مسائل

یہ ایک رُوئیداد ہے ایک جلسے کی جو آل انڈیا انجمن خواتین نے حال ہی میں منعقد کیا۔ اس جلسے میں ملک کے ہر حصّے سے خواتین تشریف لائی تھیں۔ ایجنڈا طویل تھا۔ خواتین کے مختلف مسائل پر بحث کرنا اور کسی نتیجے پر پہنچنا مقصود تھا۔

وقتِ مقرّرہ پر کارروائی جلسہ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے ایک خوبصورت شوخ لڑکی اُٹھی جس نے منی اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ بال تراشیدہ تھے۔ اس نے تجویز کیا کہ صدارت کے لیے وہ حالیہ مِس انڈیا کا نام تجویز کرتی ہے۔ اس نے کہا مِس انڈیا خواتین میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ابھی غیر ممالک کا دورہ کر کے آئی ہے، ابھی اس کی بات جاری تھی کہ ایک خاتون اُٹھی جس نے لنگی پہن رکھی تھی۔

جس کا دوپٹہ سر سے اور سر دوپٹہ سے بے نیاز تھا - اس نے تجویز کیا کہ صدارت کے لیے کسی ایکٹریس کو چُنا جائے - کیونکہ ہر ایکٹریس ہر رنگ میں رنگی ہوتی ہے وہ ہر رنگ میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی بیٹی بن کر، کبھی بیوی بن کر، کبھی ماں بن کر، کبھی گھریلو خاتون بنتی ہے تو کبھی بازاری خاتون . . . کبھی مرد کے سامنے ناچتی دکھائی دیتی ہے اور کبھی مرد کو تگنی کا ناچ نچاتی نظر آتی ہے - وقتاً فوقتاً وہ خواتین کے مسائل کو پردے پر پیش کرتی ہے - وہ پردے پر بے پردہ آتی ہے - اور بے پردہ ہو کر بھی پردہ میں رہتی ہے - اسے ملنے کے لیے نوجوان بے قرار رہتے ہیں - اسے حاصل کرنے کے لیے مُلک کے امیر ترین لوگ دیواروں سے ٹکریں مارتے ہیں . . . سینما گھروں میں پھٹتے کپڑے، کٹتی جیبیں، دھکم دھکے، اس بات کا ثبوت ہیں کہ اگر مُلک کو ضرورت ہے تو صرف ایکٹریس کی - اس کی بات طویل ہوتے دیکھ کر ایک اور خاتون اُٹھی جس کے جسم کا ہر حصّہ سوائے چہرہ کے ڈھکا ہوا تھا - اُس نے کہا کہ . . . " جلسے کی صدارت کے لیے کسی ڈاکٹر کا نام تجویز کرنا مناسب رہے گا - ڈاکٹر انسان کی نبض پہچانتی ہے - دلوں کی دھڑکنوں کو سمجھتی ہے - وہ عورتوں کے مسائل کو بہتر جانتی ہے چونکہ وہ خود عورت ہے . . . " ابھی اس کی بات ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک معمر عورت اُٹھی جس کے بال برف کی طرح سفید اور گال انگارے کی طرح لال تھے اور جس کے بڑھاپے سے جوانی ہٹنے کا نام نہیں لیتی تھی ——— اور باوجود اس کے کہ نہ اس کے منہ میں دانت تھے نہ پیٹ میں آنت ! اِدھر اُدھر دیکھ کر کڑک کر بولی کہ . . . " صدارت کے لیے ایک معمر خاتون کا چُنا جانا ضروری ہے، کیونکہ اس نے زمانہ دیکھا ہوتا ہے . . . " اتنی سی بات پر کچھ لڑکیاں کھِلکھِلا اُٹھیں، اور اس بیچ ایک کالج کی لڑکی جس نے مردانہ لباس پہن رکھا تھا اُٹھی اور کہنے لگی . . . " بہتر ہو گا کہ صدارت کے لیے کسی شاعرہ یا ادیبہ کو چُنا جائے " - ابھی اس کی بات ادھوری تھی کہ ایک اور خاتون اُٹھی اور

اسے اُٹھتے دیکھ کر اپنی اپنی تجاویز پیش کرنے کے لیے چند اور خواتین اُٹھیں۔ تو تو، میں میں شروع ہو گئی۔ سکریٹری صاحبہ نے مائک سنبھالا اور قدرے سختی سے سب کو بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اس نے کہا کہ . . . "خواتین میں دو پُرانی عادتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جہاں دو ہو جائیں، خاموش نہیں رہیں گی۔ اور دوسری یہ کہ جہاں تین ہوں گی، لڑ پڑیں گی۔ حالانکہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ خواتین نے ہر شعبہ میں ترقی کی۔ لیکن یہ مرض جاری ہے"۔ . . اس نے تجویز کیا کہ کیونکہ ایجنڈا کی پہلی آئٹم عورتوں کو مساوی حقوق ملنے کے بارے میں ہے اس لیے کسی لیڈر کو یا کسی ایسی خاتون کو جو وزیر رہ چکی ہو، صدارت کی کرسی پیش ہونی چاہیئے۔ اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا۔ صدر جلسہ نہ صرف خوبصورت تھیں اور تعلیم یافتہ ہی تھیں بلکہ ڈاکٹر بھی تھیں۔ وہ ایکٹریس ہوتیں۔ اگر پالٹیکس کے میدان میں نہ اُترتیں۔ صحیح تو یہ ہے کہ مس انڈیا ہوتیں اگر ان کے زمانے میں مس انڈیا کا انتخاب ہوتا۔ انھوں نے کرسیِ صدارت سنبھالتے ہی حالات کا جائزہ لیا۔ مستورات کے جمِ غفیر پر نظر ڈالی اور ارشاد کیا کہ تیس سال سے کم عمر کی خواتین ایک طرف بیٹھ جائیں . . . ایسا ہوتے ہی صدر جلسہ نے سب سے معمر خاتون کو عورتوں کی مساوی حقوق ملنے پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے کہا۔ اس خاتون نے کہا کہ . . . "قدرت کا قانون آج سے نہیں بنا اور جو بن گیا اس میں تبدیلی نہیں آئی۔ اور اگر لانے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتائج ہمیشہ خطرناک نکلے۔ جب سے دُنیا بنی ہے یہی دیکھا گیا ہے کہ عورت مرد کے زیرِ سایہ رہی ہے۔ بچپن میں والدین، جوانی میں خاوند اور بڑھاپے میں اس کی اولاد اس کی پرورش کرتی ہے۔ مرد عورت کا محافظ ہے اور عورت مرد کی دستِ نگر . . . عورت اس وقت تک عورت نہیں ہوتی جب تک وہ ماں نہ بنے۔ خاوند کی اطاعت، بچّوں کی پرورش اس کا فرض اوّلین ہے۔ مرد اور عورت کو قدرت نے ازل سے برابر کا درجہ بھی دیا ہے۔ اور یوں وہ

ایک ترازو کے دو پلڑے ہیں اور گرہست کی گاڑی کے دو پہیے۔ اختلافات ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بھی ایک لطف ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مردوں سے بغاوت کی جائے یا ان کی پروا نہ ہو۔ تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن علیحدہ علیحدہ لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں میں . . . عورتوں کو مساوی حقوق ملنے کے نام پر لڑکیاں لڑکے بن رہی ہیں۔ عورتوں کے لمبے گھنے بالوں کی تعریف میں شعرا نظمیں لکھتے ہیں، اور انھیں یہ کٹوائی پھرتی ہیں۔ ہر مذہب میں عورت کی عزت لازمی قرار دی گئی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی تہذیب اور تمدن کو پھر چمکائیں۔ ایسی بہت لڑکیاں ہیں جو شادی نہیں کرتیں۔ جنھیں شادی کے نام سے چڑھ ہے اور ایسی بہت لڑکیاں ہیں جو شادی اپنی منشا سے کرتی ہیں اور والدین کے سامنے اپنے خاوند کو لے کر پیش ہو جاتی ہیں۔ ان کی ناتجربہ کاری خوفناک ثابت ہوتی ہے اور ہو رہی ہے۔ عجب بات ہے کہ مساوی حقوق کے نام پر دنگا ہوتا ہے . . . اتنی بات کہی جانے پر صدر جلسہ نے دوسری طرف کی ایک نوجوان لڑکی کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کا موقع دیا۔ اس نے کہا کہ . . . اس سے پہلے کہ وہ معزز خاتون کی باتوں کے بارے میں کہے، وہ چاہے گی کہ ایجنڈے کی آئٹم ہی بدل دی جائے۔ کیونکہ مساوی حقوق تو انھوں نے چھین لیے ہیں۔ اب تو برتر حقوق ملنے کا سوال ہے جو وہ ضرور لیں گی۔ — یہ کہنا کہ مرد اور عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں، کہاں تک صحیح رہ جاتا ہے۔ جب مرد تو شراب پیتا ہے اور عورت دیکھتی رہتی ہے۔ مرد جوا کھیلتا ہے اور ہار کے آتا ہے۔ بیوی کے زیورات اور پارچات . . . مرد دیر سے گھر میں آتا ہے، بیوی انتظار میں جاگتی ہے۔ مرد خرچ کرتا ہے، بیوی خرچ بچاتی ہے۔ اور مرد کی اجازت کے بغیر ایک پیسہ خرچ نہیں کر سکتی۔ مرد جوتیوں سے بیوی کی مرمت کرتا ہے اور بیوی انھیں جوتیوں کو پھر سے پالش کرتی ہے اور پہناتی ہے۔ مرد گھر آتا ہے، بیوی پھول بچھاتی ہے۔ آنکھیں بچھاتی ہے۔ معزز خاتون جس زمانے کی بات کر رہی ہیں اُس وقت لوگ آسمان کی محض بات کرتے تھے، اب

لوگ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ اُس وقت لوگ چاند کا محض ذکر کرتے تھے،
اب لوگ چاند سے ملاقات کرتے ہیں۔ لڑکیاں پہلے لڑکیاں تھیں اب وہ لڑکے
بن گئی ہیں اور انھوں نے لڑکوں کو لڑکیاں بنا دیا ہے۔ پہلے لڑکے لڑکیوں کو
اغوا کرتے تھے اور اس ڈر کے مارے والدین اپنی لڑکیوں کو اکیلے گھر سے باہر
نہیں جانے دیتے تھے، اب لڑکیاں غیر ممالک میں اکیلی جاتی ہیں۔ گھومتی پھرتی
ہیں۔ . . محترمہ نے بچے پیدا کرنے کی بات کہی ہے۔ اس کی نظر میں جیسے
ملک میں مسائل ہی نہیں، بچے اُٹھانا اور اُٹھائے لیے پھرنا مصیبت ہے۔ شادی
اپنی پسند کی ہونی چاہیئے اور اپنی مرضی سے . . . جب جی چاہا شادی کر لی
جس سے چاہا شادی رچالی۔ اور جب دل نے چاہا طلاق لے لی یا پھر سمجھوتہ
کر لیا ——— رہی والدین سے مشورہ کی بات تو یہ بات غیر مناسب تو نہیں
مگر اتنی ضروری بھی نہیں۔ کیونکہ تعلیم لینے کا فائدہ ہی تب ہے اگر اس کا پورا
فائدہ اُٹھایا جائے اور کام میں لایا جائے۔ محترمہ کے وقت میں والدین اپنی
پسند کا لڑکا ڈھونڈھتے تھے۔ اور غریب لڑکی اپنی دونوں آنکھوں سے تو کیا
ایک آنکھ سے بھی دُولھا کو اس وقت تک نہیں دیکھ سکتی تھی جب تک اس کا
دولھا میاں اپنے ہاتھوں سے اُس کی آنکھیں کھول کر اس کو خود کو دیکھنے پر
مجبور نہیں کرتا تھا۔ ان لڑکیوں کی اپنی پسند کچھ نہ تھی جس کے چاہا پلّے باندھ
دیا۔ اور وہ پلّہ مرتے دم تک بندھا رہتا تھا۔ اب لڑکیاں لڑکوں کو پرکھتی ہیں، ان
کی عادتوں کو سنوارتی ہیں۔ ان کے ساتھ گھوم پھر کر اپنے رنگ میں ڈھالتی ہیں
پھر شادی کی بات سوچتی ہیں، وہ اپنی مرضی سے بچے پیدا کرتی ہیں اور رہتی ہیں۔
اب ذرا معزز خاتون سے پوچھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایک درجن بچے گھر
میں ہیں۔ اور دادی اماں بننے کے بعد بھی ماں بننے کی خواہش برقرار ہے۔ جیسے
انھیں یہی کام ہے ——— پہلے شادی گڈّے گڈّی کی ہوتی تھی۔ دلہن چادر میں
چھپی خاوند کے پیچھے چلتی تھی۔ جیسے کوئی منڈی سے مال خرید کر لایا ہو، اور اسے

دوسروں کی نظر سے چھپا کر لے جانا چاہتا ہو۔ کئی دفعہ بیوی بدل گئی۔ پہلے وہ گھر سے نکلتی تھی روتی ہوئی۔ وہ خود روتی تھی۔ گھر والوں کو رُلاتی تھی۔ چند دن تک خاوند کو بھی رُلاتی تھی۔ اب لڑکی گھر سے ہنستی نکلتی ہے۔ قلانچیں بھرتی جاتی ہے بمسّت رہتی ہے۔ اب ان محترمہ سے پوچھیے، شادی کے معنی خوشی کے ہیں یا غمی کے اور رنج والم کے۔ . .
پہلے وہ اپنے خاوند کو خدا اور اس کا مالک سمجھتی تھی۔ وہ خدا کا نام لے سکتی تھی، لیکن خاوند کا نام نہیں لے سکتی تھی ڈرتی رہتی تھی۔ اب رہی لباس کی بات تو ذرا معزز خاتون یہ لباس پہن کر دیکھے تو یقیناً وہ اپنے سب پرانے لباس ضایع کردے تاکہ کوئی اور نہ پہن لے۔ . . اب خواتین دوپٹوں اور چادروں کے وزن نہیں اُٹھا سکتیں۔ وہ صنفِ نازک ہیں اور بوجھ اُٹھانے کے لیے مرد ہیں۔ وہ مردوں کے لیے سرمایۂ عیش ونشاط نہیں۔ انھوں نے برتر حقوق چھیننے کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔ . . .
اتنا کچھ کہے جانے کے بعد صدرِ جلسہ نے ارشاد کیا کہ وہی معزز خاتون اپنا جواب دیں۔ محترمہ پہلے ہی جلی بھُنی بیٹھی تھی آستینیں کرلیں اور لگیں بے نقط سنانے اور صدر جلسہ کے منع کرنے پر بھی باز نہ آئیں۔ اس کی حمایت میں چند اور معزز خواتین اُٹھیں۔ اِدھر لڑکیوں نے بھی قدموں کو حرکت دی۔ تشبیہات اور استعاروں میں باتیں شروع ہوئیں۔ حالات کو بگڑتے دیکھ کر صدر نے کہا کہ . . . سکریٹری جلسہ تو پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ ہماری شامت ہے کہ جہاں دو عورتیں ہوں گی خاموش نہیں رہیں گی اور ان میں ایک کا اضافہ ہو تو لڑیں گی۔ انھوں نے فیصلہ دیا کہ ایجنڈے میں تبدیلی لائی جائے اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے آئندہ میٹنگ بلائی جائے۔ جلسہ برخاست ہوا۔ انجمن خواتین کے دوسرے جلسہ کی تاریخ کا اعلان نہیں ہوا۔ جب بھی ہوگا اس کی روئیداد پھر پیش کروں گا۔
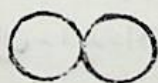
ایک نشِست

مُقَرّرہ وقت ہو چکا ہے۔ کچھ اصحاب تشریف لے آئے ہیں۔ کچھ تشریف لا رہے ہیں۔ کچھ اس لیے دیر سے تشریف لائیں گے کہ حاضرینِ محفِل کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو جائے۔ آنے پر دست بستہ معافی مانگیں گے۔ دیر سے آنے کے لیے عذر خواہی کریں گے۔ پھر سامنے دیکھیں گے، اِدھر اُدھر نظر دوڑائیں گے کہ ان کی نشِست کے لیے کون سی جگہ موزوں رہے گی۔ تھوڑا ٹھٹھکیں گے کہ کوئی آواز دے، اجی حضرت آگے تشریف لائیے، ادھر آجائیے اجی اِدھر دیکھیے . . . جھجکتے ہوئے بڑھیں گے، رُکیں گے، پھر بڑھیں گے۔ کچھ اس انتشار سے بچنے کے لیے اور بچانے کے لیے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جائیں گے اور خاموش رہیں گے۔ یہ انتشار چلتا آیا ہے، چلتا رہا ہے، چلتا

رہے گا۔ ادب کی محفلیں بے ادبیاں دُور کرنے کے لیے منعقد ہوتی ہیں۔ لیکن ادب سے بے ادبیاں دُور نہیں ہوئیں۔ کچھ وقت سے بہت پہلے تشریف لائے ہیں۔ کچھ وقت سے بہت بعد تشریف لائیں گے۔ کچھ اختتامِ محفل کے بعد بھی دیر سے تشریف لے جائیں گے کیونکہ ان کا مقولہ ہے :

دیوانے سے پابندیِ اوقات نہ ہوگی

حاضرین میں شعراء، ادباء، نقّاد اور مفکّر ہیں، استاد ہیں۔ استادوں کے استاد ہیں، شاگرد ہیں، شاگردوں کے شاگرد ہیں، سخنور ہیں، سخن فہم ہیں، عاقلِ باعمل ہیں، عالمِ بے عمل ہیں۔ خوش خلق، خوش کلام، خوش خیال ہیں، تر دماغ، تر زبان، زندہ دل، رنگین طبع، شوخ و بے باک، چُست و چالاک ہیں۔ تربیت یافتہ ہیں، سند یافتہ ہیں، سبھی بازبان ہیں۔ کچھ زبان کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔ کچھ "بے زبانی ہے زباں میری" کے قائل ہیں۔ ان میں وہ ہیں جن کا علم و فضل میں طوطی بولتا ہے۔ منطق و فلسفہ میں جھنڈا گڑا ہے۔ قلم و شائستگی میں سکّہ بیٹھا ہے۔ سائنسی معلومات میں دھاک بندھی ہے۔ تاریخ کا ذکر چھیڑیے، ازل سے ابد تک کی کیفیت حاضر —— سیّاروں کا ذکر کیجیے تو سیّاروں سے باتیں کرا دیں —— چاند کی بات کریں تو چاند سے ملاقات کرا دیں —— علمِ طبیعات کا مطالعہ ان پر ختم —— کیمیا ان کی لونڈی، نجوم ان کا غلام —— حکمت میں ارسطوئے ثانی، مصوّری میں رشکِ بہزادِ ثانی —— ادب ہو یا فلسفہ، حدیث ہو یا فقہ سب پر حاوی —— ذہانت و فطانت کے مجسّمے یہاں موجود، شوخی و بذلہ سنجی کے مرقع یہاں حاضر —— حاضر جوابی میں طاق —— برجستہ گوئی میں مشّاق —— آوازہ کسنے میں شہرۂ آفاق —— لطیفہ گوئی میں استاد —— یہاں حاضر ہیں۔ اپنا نام اُچھالنے اور دُوسروں کی پگڑی اُچھالنے والے، فقرہ چُست کرنے، پھبتی کسنے، کسی کو بنانے

کسی کو چٹکیوں میں اُڑانے، ٹھٹھول میں، چھیڑ چھاڑ میں، فصیح البیانی، طلاقتِ لسانی میں سب سے آگے یہاں ملیں گے۔ بات بنانے والے، بات اُڑانے والے، بات پیدا کرنے والے، بات میں بات پیدا کرنے والے، بات سے بات نکالنے والے، بات میں بات ڈالنے والے۔ بات بات میں قافیہ کا قافیہ تنگ کرنے والے یہاں حاضر ہیں۔ آپ انھیں مضمون پانی کا دیجیے، مضمون کو پانی پانی کر دیں۔ کسی کے چہرے پر چلبلا نہ تبسّم گلستاں کی طرح کھلا ہے۔ کسی کے بشرے سے ادب ٹپک رہا ہے۔ کسی کے شرافت . . . ٹپک ضرور کچھ نہ کچھ رہا ہے۔ کچھ محض سنانے آئے ہیں۔ کچھ محض سننے آئے ہیں۔ کچھ محض وقت کاٹنے آئے ہیں۔ کچھ واہ وا کہنے آئے ہیں، کچھ واہ وا سننے آئے ہیں۔ . . . کچھ رنگِ محفل دیکھنے آئے ہیں۔

کچھ سگریٹ پئیں گے، ایک آدھ پئیں گے، رُک رُک کر پئیں گے۔ تھم تھم کے پئیں گے، کچھ مسلسل پئیں گے، کچھ دھواں مُنہ سے نکالیں گے۔ کچھ ناک سے نکالیں گے۔ کچھ ناک اور مُنہ کا ملا جلا دھواں نکالیں گے، کچھ سگریٹ اپنی لائیں گے، کچھ مانگ کر پئیں گے، کچھ لانا بھول آئیں گے اور مانگ کر پینا پسند نہیں کریں گے۔ اور دل میں کڑھتے رہیں گے۔ کچھ دانستہ نہیں لائیں گے، کچھ سگریٹ پیتے ہوئے مضمون کہیں گے، کچھ پی کر کہیں گے۔ کچھ کہہ کر پئیں گے۔ کچھ سگریٹ کے متلاشی فرمائیں گے:

پھر دیکھیے کیا ہوتی ہے تقریر دھواں دھار
رکھ دے کوئی سگریٹ کا ڈبہ مرے آگے

ڈبہ پیش کیجیے، پھر دیکھیے سگریٹ سے دھواں نکلے گا، تقریر سے دھواں نکلے گا۔ مُنہ سے دھواں نکلے گا، ناک سے دھواں نکلے گا اور پھر پھر سے دھواں نکالنے کی کوشش کی جائے گی، پنکھے چلیں گے، پردے ہٹیں گے، کھڑکیاں کھلیں گی، دروازے کھلیں گے۔

صاحبِ خانہ نے گرم چائے، ٹھنڈے شربت کا انتظام کر رکھا ہے۔ کچھ کہیں گے، یہ تکلف کیسا اور کیوں۔ ۔ ۔ ؟ کیا ضرورت تھی۔ جب پینے کا وقت آئے گا تو کچھ محض گرم پینا پسند کریں گے کچھ محض ٹھنڈا۔ ۔ ۔ کچھ پہلے گرم بعد میں ٹھنڈا۔ کچھ پہلے ٹھنڈا بعد میں گرم کچھ پیتے رہیں گے۔ کچھ یہ سوچتے ہی رہیں گے کہ پہلے گرم پیا جائے یا ٹھنڈا۔ ۔ ۔ کچھ بالکل ہی نہیں پئیں گے۔ کچھ ایک بار پئیں گے۔ کچھ بار بار پئیں گے۔ کچھ آنکھ بچا کر، کچھ آنکھ چرا کر پئیں گے کچھ سامنے رکھ کر پئیں گے۔ دکھا دکھا کر پئیں گے۔ کچھ گھونٹ گھونٹ پئیں گے کچھ غٹ غٹ پئیں گے۔ کچھ قطرے فرش پر گراتے پئیں گے۔ کچھ چاہیں گے یہ سلسلہ شروع ہی میں شروع ہو جائے۔ کچھ چاہیں گے درمیان میں ہو۔ کچھ چاہیں گے اختتام پر ہو تاکہ تازہ دم ہو کر گھر واپس جائیں ـــــ اور کچھ چاہیں گے یہ سلسلہ شروع میں ہی شروع ہو جائے اور اختتام کے بعد بھی کچھ دیر چلتا رہے تاکہ اُن میں اور محفل میں برابر جان پڑتی رہے۔

مشاعرہ کا آغاز ہونے والا ہے۔ شعرا نے بیاضیں سنبھال لی ہیں۔ شیروانیوں کے بٹن ڈھیلے کر دیے ہیں۔ گلا صاف کرنے کے لیے کھنگارنا شروع کر دیا ہے۔ ان میں فر فر بولنے والے، رُک رُک کر بولنے والے، آہستہ بولنے والے، چیخ کر بولتے والے، ناک سے بولنے والے، لکنت سے بولتے والے سبھی قسم کے بولنے والے موجود ہیں۔ کچھ طبع زاد لائے ہیں۔ دماغ کا عرق نکال کر لائے ہیں۔ کچھ مال مسروقہ لائے ہیں، کچھ مال مسروقہ کو اپنا مال کہہ کر لائے ہیں۔ کچھ اشعار آبدار، غزل فصاحت بار لائے ہیں۔ کچھ نئی بات نئے رنگ میں سُنائیں گے، کچھ پُرانی بات پرانے ڈھنگ سے سُنائیں گے۔ خوش گلو ترنم سے سُنائیں گے، کچھ خوش گلو نہ ہوتے ہوئے بھی ترنم سے سُنائیں گے۔ کچھ نظم کو نثر کی طرح، اور کچھ نثر کو نظم کی طرح پڑھیں گے۔ کسی کا مضمون اور بیان دونوں صحیح ہوں گے، کسی کا مضمون صحیح ہو گا تو بیان غلط۔ کسی کا بیان صحیح ہو گا تو مضمون غلط۔ کسی کا مضمون اور بیان دونوں غلط

ہوں گے۔ کچھ اچھوتا شعر کہیں گے اور داد ملنے پر سلام بھی نہ کریں گے۔ اور کہیں گے سلام کس بات کا۔ ہر شخص تھوڑے ہی شعر کہہ سکتا ہے۔

ابھی ایک شاعر اٹھیں گے، فرمائیں گے۔ ۔ ۔ "ایک تازہ غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے" پہلا شعر کہتے ہی ماحول رکھیں گے۔ واہ وا ہو گئی واہ وا ۔ ۔ ۔ ورنہ اپنے مہربانوں کی طرف نیازمندانہ اور ملتجی نظروں سے اور کنکھیوں سے دیکھیں گے کہ ماحول پیدا کر دیں۔ اس کے لیے ہتیرے چلائیں گے۔ ہاتھ اٹھا کر ہاتھ بڑھا کر داد مانگیں گے۔ اپنی کوئی نظم یا کوئی شعر کسی کی نذر کریں گے۔ کچھ داد دینے کی غرض سے، کچھ داد لینے کی غرض سے داد دیں گے۔ چند اشعار ختم ہو جائیں گے۔ غزل جاری رہے گی۔ ابھی دوسرے شاعر اٹھیں گے، فرمائیں گے ۔ ۔ ۔ "وقت کی کمی کی وجہ سے تازہ غزل نہیں لکھ سکا۔ ایک خوبصورت نظم سنیے۔ اُدھر کونے سے آواز آئے گی ۔ ۔ "تکلیف فرمانے کی کیا ضرورت ہے۔ نئی محفل ہے نئی بات سنائیے ۔ ۔ " اور دوسرے کونے سے آواز آئے گی۔ یہ تو صاحب آپ ہمیشہ ہی کہتے ہیں۔" اس پر قہقہہ پڑے گا۔ تیسرے شاعر کی باری آئے گی، فرمائیں گے ۔ ۔ ۔ "میں اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں لکھتا ہوں۔ میں یہ نہیں سمجھ پا رہا کہ کون سی زبان میں سناؤں ۔ ۔ " اور کھٹ سے آواز آئے گی ۔ ۔ "بنگالی اور گجراتی بھی سیکھ لیجیے ۔ ۔ " اور دن سے قہقہوں کے درمیان ایک صاحب فرمائیں گے ۔ ۔ "اجی اس زبان میں سنائیے جو آپ کی زبان ہے ۔ ۔ " چوتھے صاحب بہت مستند شاعر ہیں۔ اپنے شاگرد ہمراہ لائے ہیں۔ ابھی ان کا مصرعہ مکمل نہیں ہوگا اور شاگرد واہ وا کا نعرہ بلند کریں گے۔ شاعر صاحب کہتے جائیں گے۔ اور واہ وا کا نعرہ سنتے جائیں گے۔ اور اس واہ وا کے درمیان ایک صاحب اٹھیں گے، فرمائیں گے۔ خوب کہا صاحب! بار بار کہیے۔ اور آہستہ سے یہ بھی کہہ دیں گے۔ لیکن گھر جا کر یا نجیں شاعر بسیار لکھنے والے ہیں۔ اٹھتے ہی

فرمائیں گے . . . " ایک قطعہ سُنیے اس کے بعد ایک دو رباعیاں ہوں گی۔ اس کے بعد ایک نظم اور ایک غزل پیش کروں گا۔ ناظم مشاعرہ دست لبستہ کہیں گے۔ فی الحال ایک یا دو چیزیں کہہ دیں۔ دوسرے دَور میں آپ کو پھر موقع ملے گا۔ یہ بات ان کو ناگوار گزرے گی۔ وہ بغیر سُنائے، بیٹھ جائیں گے۔ پچھلے شاعر اُٹھیں گے اور غزل شروع کر دیں گے اور رُکنے کا نام نہیں لیں گے۔ پھر آواز آئے گی "غزل خوب ہے، خوب تر ہے، لیکن کیا آپ سرِ راہے یہ بتانے کی زحمت فرمائیں گے، کہ غزل کے کتنے اشعار باقی ہیں" وہ بیٹھیں گے تو ایک شاعر جن کا نام ابھی دُور ہے، اُٹھیں گے اور فرمائیں گے . . . " معاف فرمائیے ایک شعر حسبِ حال ذہنِ ناقص میں آیا ہے"۔ اور ابھی وہ اپنی بات پوری نہ کر پائیں گے کہ آواز آئے گی۔ "ذہنِ ناقص سے ناقص شعر نکلے گا، تشریف رکھیے اور انتظار کیجیے" اگلے صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں، سنجیدہ ہیں۔ بغیر کسی تمہید کے غزل شروع کر دیں گے اور مختصر غزل کے ہر شعر پر داد لیں گے۔ اور انھیں مجبور کیا جائے گا کہ وہ ایک اور غزل پیش کریں۔

اب آپ مشاعرہ سماعت فرمائیے۔ مشاعرہ کی مکمل روئیداد آئندہ نشست میں سُناؤں گا۔

" یار زندہ صحبت باقی "

شور کے تڑکے عطر بیز و عنبر بار نسیم سحری نے جگایا۔ دل سیر کو چاہا۔ اٹھا اور گلاب کے پھولوں کے باغ میں گلشن کا جوبن لوٹنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔

خوش و خرم، خندان و فرحاں، شگفتہ طبع، تازہ دم اس چھوٹی سی دنیا میں داخل ہوا۔ بارش سے دھلا ہوا باغ پتہ پتہ بے داغ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ رنگا رنگ نازک پھولوں کی بھینی بھینی مہک نے دماغ کو تر و تازہ کیا۔ تازہ ہوا کے جھونکوں نے تازگی بخشی۔ پرندوں کی چہک میں نغمے گونجتے سنائی دے۔ پتوں کی لہک اور قطرہ ہائے شبنم کی جھلک دیکھ کر جسم کھل اٹھا۔ شاخِ گل کی کج ادائی اور گلوں کی رعنائی نے محویت طاری کی۔ جس شجر کو دیکھا نہال . . . جس پودے کو دیکھا گلوں سے مالامال . . . روشیں صاف و شفاف، خوبصورت پٹریاں بے خس و خاشاک۔

یہ حالت دیکھ کر مجھ پر مستی کا عالم طاری ہوا اور میں مستانہ وار جھوم اُٹھا۔

آگے بڑھا . . . جس گُل پر نظر پڑی ، شگفتہ تھا اور کُشادہ دلی سے دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ جس پھول کو سونگھا ، مُشک و عنبر کا لُطف آیا جس گُل پر آنکھ گڑی ، خاموش زبان سے پکار اُٹھا ٹھہریے . . . مجھ سے ملیے ، مجھے دیکھیے ، مجھے پرکھیے ، تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔ میں بھی تم سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔ میں نے تمھیں بلایا ہے۔ تم نے مجھے زندگی دی ہے ، میں تمھیں زندگی دوں گا۔ لیکن مجھے ہاتھ نہ لگائیے۔ مجھے توڑیے نہیں۔ میں زندہ ہوں تمھاری طرح میں زندہ رہنا چاہتا ہوں تمھاری طرح ——— جیسے تم بچپن ، جوانی اور بڑھاپے کے مزے لوٹتے ہو ویسے ہی قدرت نے مجھے حق دیا ہے۔ میں پھول کے پاس خاموش بیٹھ گیا۔ لیکن کب تک . . .

آگے بڑھا ، غنچے پیاری ادا سے چٹک رہے تھے۔ ان کو چٹکتے دیکھ کر میرا غنچۂ دل چٹکا . . . تتلیاں ، پتے جل ترنگ بجا رہے تھے۔ سارنگ گا رہے تھے۔ ملہار سُنا رہے تھے۔ شاخیں مستانہ وار جھوم رہی تھیں۔ تو بہ شکن بہار عجب سنسناہٹ پیدا کر رہی تھی۔ باغ جھومتا نظر آ رہا تھا۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو اُٹھا۔

تماشائے رنگ و بو دیکھتا ہوا ، نشۂ گلگشت میں مخمور ، بادۂ مسرت میں چُور آگے بڑھا۔ دیکھا چند شوخ و شنگ طرحدار نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جوانی کی اُمنگ اور شباب کی ترنگ میں جھوم رہے تھے ، ناچ رہے تھے ، گا رہے تھے۔ میں ٹھٹھک گیا۔ لڑکیوں نے اپنے گہرے گھنے سیاہ بالوں میں گلاب کے پھول اُڑسے ہوئے تھے۔ زلفیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ ناگن کی طرح بل کھا رہی تھیں۔ سر دوپٹوں سے بے نیاز ——— آدھا جسم لباس سے بیزار۔ کسی کے بدن پر گہرے رنگ کے گھٹے کپڑے اپنا رنگ دکھا رہے تھے۔ تو کسی کے باریک کپڑوں سے جسم کا رنگ اپنی رنگینی دکھا رہا تھا۔ کوئی نکیلی ، رنگیلی ،

چھیل چھبیلی، البیلی تھی کوئی گلعذار، گلبدن، گُل رنگ، گلنار، گلفام، نازک اندام تھی کوئی ہلال ابرو، نازک کمر، رشکِ قمر، حور لقا، نازنیں، زہرہ جبیں، سیم تن تھی، کوئی خوش رو، خوش خو، خوش خصال، خوش جمال، خوش خیال تھی۔ کوئی بلا کی شوخ و چالاک، غضب کی بے باک، سر سے پاؤں تک چُست تھی، کوئی آہو چشم، کسی کی آنکھیں نرگسی، کوئی سرو قد، کسی کی چال مستانہ، کسی کی چال میں ٹھمک، ستم کی ادا، قیامت کا نکھار، پُر وقار او راس پر طرہ یہ کہ بناسنگھار، وہ چھیڑ وہ پھبتی، وہ چہچہے وہ قہقہے وہ اچپلاہٹ کہ الاماں، وہ چلبلاہٹ کہ الحذر، وہ شوخی کہ الحفیظ ——— فرطِ مستی میں خیالِ ناموس نہ پاسِ ننگ . . . بلا کے رنگیلے، غضب کے چھیل چھبیلے، لڑکے کھڑکیلے، گہرے رنگ کے تنگ لباس پہنے، سر کے بال اور ہاتھوں کے ناخنوں کو بڑھائے تماشی مالائیں گلے میں ڈالے۔ کمر میں زنجیریں باندھے ایک دوسرے سے محوِ اختلاط تھے۔ ہاتھوں میں ہاتھ دیے، ہاتھوں میں ہاتھ لیے وہ ناچ رہے تھے۔ گا رہے تھے۔ فلموں کی باتیں، ایکٹر یسوں کا ذکر، فیشن پردائے زنی، رنگین بننے اور بنانے کے تذکرے چھڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے باتیں ہو رہی تھیں۔ ہاتھوں سے باتیں ہو رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی چنچلا کا یومِ پیدائش منایا جا رہا تھا۔ جو کچھ سال پہلے اسی تاریخ کو صبح کے وقت ہی دُنیا میں تشریف لائی تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی ہر چیز مشابہ تھی۔ لباس، رنگ، بات، خیالات سب ایک سے تھے۔ تمیز کرنا دشوار تھا۔ وہ مسکراتے تھے۔ وہ ہنستے تھے، وہ قہقہے لگاتے تھے۔ وہ زندگی سے زندگی لے رہے تھے وہ زندگی کو زندگی دے رہے تھے۔ میں یہاں بھی زندگی لینے کے لیے رُک گیا۔ دزدیدہ نگاہوں سے نظارہ بازی کرتا رہا اور شمع رخسار، شعلہ رو سے آنکھیں سینکتا رہا۔ دل اٹک کر ٹک گیا۔ قدم نے آگے قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔ اُوپر کالی گھٹائیں، نیچے کالی گھٹائیں یہ دیکھ کر برق سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے بھی چشمک زنی شروع کر دی۔ مجھے میری جوانی نہیں میرا بچپن لوٹتا نظر آ رہا تھا۔ میں اُمنگ سے بھرا تماشہ دیکھتا رہا۔ آخر کب تک۔

آگے بڑھا - چند بزرگ قسم کے لوگ اکٹھے آ رہے تھے - بڑے عیار، بڑے تجربہ کار، بڑے جہاں دیدہ، بڑے سن رسیدہ، ان میں سے کچھ تو گھر سے نکل کر آئے تھے کچھ نکالے ہوئے آئے تھے - ایک ہی نظارہ میں آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا - مجھے محسوس ہوا میرا لوٹتا ہوا بچپن پھر لوٹ گیا تھا - میری مڑتی ہوئی جوانی پھر مڑ گئی تھی اور میرا بڑھاپا وقت سے بہت پہلے تشریف لا رہا تھا - میں وہاں سے بھاگا -

اچانک قبلہ کے رخ سے کالی متوالی گھٹا جھومتی ہوئی اٹھی - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، برق کی بے تابی، رعد کی گرج نے دل اور دماغ کو یکجا کیا - قطرہ افشانی ہوئی - رم جھم بارش شروع ہوئی - موسلا دھار مینہہ برسنے لگا - باغ خاموش ہو گیا - گلوں نے بات چیت بند کر دی - محفلیں ختم ہوئیں -

سوچا کیا ہوا کیا

قریب ساٹھ سال پہلے کی بات ہے کہ ہم اس دُنیائے فانی
میں تشریف لائے۔ والدین کی پہلی اولاد اور پھر اولادِ نرینہ۔ کوئی زیور لے کر
آیا، کوئی پارچہ، کوئی نقدی لایا تو کوئی کھلونے۔ کوئی سر پر ہاتھ پھیرتا۔ کوئی گود
میں لیتا، کوئی دعائیں دیتا۔ کوئی مُنہ چومتا۔ دعوتیں ہوئیں، ناچ گانے ہوئے۔
غرضیکہ گھر میں ایک ہنگامہ ہوا۔ اور ہم بھی خاموش نہیں رہتے تھے، چیختے چلاتے
دُنیا میں وارد ہوئے تھے۔ چیختے چلاتے رہتے۔ خاموش ہوتے تو سوچنے لگتے۔ کیا
سوچتے تھے ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں اپنی پیدائش کے حادثے کا پتہ
بھی بہت دیر کے بعد لگا۔ اتنا یاد ہے کہ اس کے بعد زندگی میں ہر قدم سوچ سوچ
کر اُٹھایا۔ قدم اُٹھانے سے پہلے سوچتے تھے۔ قدم اُٹھا کر سوچتے تھے۔ ہر قدم پر

سوچتے جاتے تھے۔ زندگی کی اُلجھنوں میں پھنس کر کبھی ہم سوچتے کہ ہم پیدا ہی کیوں ہوئے۔ کبھی سوچتے اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم پیدا ہی نہ ہوتے۔ ایک آدھ بار خودکشی کی سوچی مگر اور سوچوں کی طرح یہ سوچ بھی بیکار گئی۔

ابھی کمسن تھے، اسکول میں داخل ہوئے۔ میاں جی نے الف، ب شروع کرائی، شروع میں بڑے پیار سے پڑھاتے تھے۔ شاید اس مٹھائی کا اثر تھا جو انھیں خوشامد سے دی گئی تھی۔ ذرا اور بڑھے تو تھپڑ سے بات کرنے لگے۔ اب ہمیں کیا پتہ کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ میاں جی خود لڑکوں سے ڈر کر سبق پڑھایا کریں گے۔ ورنہ میاں جی کو ہم بھی سبق پڑھا دیتے، شرارت رگ رگ میں بھری تھی۔ اسکول میں پٹتے۔ راستے میں یہ سوچ کر کہ باغباں کہیں اِدھر اُدھر ہو گا، درخت پر چوری سے چڑھ کر آم توڑتے اور پکڑے جانے پر پٹتے۔ گھر والوں کو ہماری شرارتوں کا پتہ لگتا۔ گھر میں پٹتے۔ آخر یہ شرارت چھوڑی اور پڑھائی میں شرارت شروع کر دی۔ ہم ہر وقت یہی سوچتے تھے کہ ہم سے کوئی دوسرا لڑکا آگے نہ نکلنے پائے۔ والدین سوچنے لگے ہمارا نام روشن کرے گا۔ استاد سوچنے لگے، اسکول کا نام چمکائے گا۔ قدرت کو کیا منظور، یہ وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ اور پھر قدرت کسی کو سوچنے کا موقع ہی کب دیتی ہے۔

کچھ اور بڑے ہوئے۔ . . ناچ، گانے کے رسیا اور حسن کے دلدادہ بن گئے ہوا یوں کہ شہر میں رام لیلا کی ایک پارٹی آئی۔ کھیل دیکھنے ہم بھی گئے۔ کرشن آیا، پیلے کپڑے، سر پر مور مکٹ۔ ہاتھ میں بانسری مگر رنگ کا سانولا تھا۔ دوسری طرف سے رادھا نمودار ہوئی۔ سجی بنی اور رنگ کی گوری چٹی۔ ان کے پاؤں کی تھرک پر ہمارے پاؤں بھی تھرکنے لگے۔ کھیل ختم ہوا۔ مگر ہمارے کانوں میں گھنگھروؤں کی چھنا چھن اور طبلے کی دھنا دھن برابر آتی رہی۔ اور رس گھولتی رہی۔ ہوش تب آیا جب ہمارے کان اینٹھے گئے۔ یہ سوچ کر کہ منڈلی والوں سے جا کر ملیں۔ ہم ڈیرے پر پہنچے۔ ایک بہت خوبصورت لڑکا دھوتی پہنے اور انگوچھا لیے نہانے

کی تیاری کر رہا تھا اور ایک سانولے رنگ کا لڑکا جس کے نقش بہت تیکھے تھے، پاس ہی کھڑا تھا۔ پتہ لگا یہ لڑکا کرشن بنتا ہے اور سانولے رنگ والا رادھا۔ ہم تو کچھ اور سوچ کر گھر سے نکلے تھے، نظر کچھ اور ہی آیا۔ یہی سوچتے سوچتے گھر واپس آ گئے کہ یہ لڑکا لڑکی کیسے بن گیا تھا۔

اور بڑے ہوئے، رام لیلا، نوٹنکی، ناٹکوں کی دنیا سے کودتے پھاندتے اسٹیج کی دنیا میں پہنچے۔ پہلا ڈرامہ لیلیٰ مجنوں دیکھا۔ پٹاخہ چھوٹتے ہی پردہ اٹھا اور سامنے ہی ایک خوبصورت نوجوان پھٹے کپڑوں میں ملبوس آہ وزاری کرتا اور لیلیٰ لیلیٰ پکارتا نظر آیا۔ اس کی چیخ پکار سن کر ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اتنے میں ایک کالے رنگ کی لڑکی قیمتی لباس میں ملبوس نمودار ہوئی۔ یہ لیلیٰ تھی۔ اس نے آتے ہی مجنوں کو سنبھالا۔ ہم یہ سوچ کر حیران ہوتے رہے کہ مجنوں کو اس لڑکی میں کون سی خوبصورتی نظر آئی۔ مگر اس وقت ہمیں کیا پتہ کہ عشق ایک مرض ہے۔ ہم نے اس کیفیت کو سوچا اور سوچتے سوچتے گھر واپس آ گئے۔

تماش بینی کا اثر یہ ہوا کہ ہم نے چوری چھپے ایکٹنگ سیکھنا شروع کیا۔ اور لیلیٰ مجنوں، سسی پنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا، وامق عذرا کے سب پارٹ ازبر کر لیے۔ ایک دفعہ مجنوں کے رول کے لیے ہمیں بھی چن لیا گیا۔ جب ہم اسٹیج پر پہنچے۔ خلقت کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ لوگوں نے تالیاں پیٹنی شروع کر دیں۔ منتظمین سوچ میں پڑ گئے۔ اس سے پیشتر کہ ہم پر گلے سڑے انڈوں کی بارش اور اسٹیج پر چڑھ کر پردوں کو پھاڑنے کی رسم ادا ہوتی۔ ہمیں اچانک نوٹنکی کا ایک کردار یاد آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم شروع ہو گئے۔ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ اور اب منتظمین کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔

تھیٹر کی دنیا سے بائیسکوپ کی دنیا میں پہنچے۔ ایک رات سوتے میں بڑبڑانے لگے۔ ۔ ۔ "واہ استاد بیڈرو، کیا چھلانگ لگائی ہے۔ ۔ !" اتنا کہتے ہی ہم بستر سے اچھل کر زمین پر آ گرے۔ اب ہمارا کہیں آنا جانا ہی بند

کردیا گیا۔ پہلے گھر والے سوچ رہے تھے کہ لڑکا نام پیدا کرے گا۔ اب سوچ رہے
تھے کہ اس لڑکے کا بنے گا کیا۔ ادھر ہم الگ سے سوچ رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ ہماری سوچ کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔ اچانک کہیں سے پتہ
چلا کہ بمبئی میں کوئی کمپنی ایکٹروں کو بھرتی کرتی ہے۔ ہم نے اُن سے چوری چھپے رابطہ
قائم کیا۔ ان کا جواب ملا کہ پچاس رُوپے بھیج دیے جائیں۔ فارم بھیج دیے جائیں گے
ہم نے سوچا اس طرح دیر لگے گی۔ گھڑی وغیرہ گروی رکھی اور بمبئی پہنچ گئے۔
ایک تنگ و تاریک گلی میں سے ہوتے ہوئے جب ہم متعلقہ دفتر کے بالکل سامنے
پہنچے اور ایک بہت بڑا بورڈ نظر آیا تو ہماری باچھیں کھل گئیں۔ ہم سیڑھیوں پر
چڑھنے کی سوچ ہی رہے تھے کہ ایک مضبوط ہاتھ نے ہماری کلائی پکڑی اور پوچھا
"آپ نے بھی میری طرح پچاس رُوپے بھیجے تھے . . ." پھر مجھے گھسیٹتے ہوئے یہ کہہ کر
وہاں سے لے گئے . . . " میاں یہاں تو بورڈ ہی بورڈ ہے۔ مجھے یہاں اور بھی
تجربے ہو چکے ہیں۔ یہ بمبئی ہے چلو گھر واپس چلیں . . ." ہم نے سوچا اور ان کی
بات مان کر گھر واپس آ گئے۔

فلمیں اب بھی ہم باقاعدگی سے دیکھتے ہیں۔ فرسٹ ڈے، فرسٹ شو، فرسٹ
ٹکٹ، فرسٹ رو، اب بھی ہمارا موٹو ہے۔ مگر اب جب ہم یہ سُنتے ہیں کہ اب ایکٹر
فلموں میں لاکھوں روپیہ لیتے ہیں تو ہمارا سینہ کباب ہو جاتا ہے۔ اور دل بیٹھنے
لگتا ہے۔ اور ہم ایک لمبی سرد آہ بھر کر اتنا کہنے پر اکتفا کر لیتے ہیں . . " سوچا
کیا، ہوا کیا"

تغیّرات ہیں زمانے کے

ایک صاحب ہمیں ایک صاحب کے گھر لے گئے۔ معلوم ہُوا جو بارے میں تشریف فرما ہیں۔ اوپر پہنچے۔ دیکھا بستر پر لیٹے مطالعہ فرما رہے ہیں۔ ہمارے صاحب نے ہمارا تعارف کرایا۔ انھوں نے اچٹتی نظروں سے دیکھا۔ لیٹے لیٹے ہی مصافحہ کیا اور اُٹھ بیٹھے۔ ہمارا تعارف تو دو لفظوں میں ختم ہو گیا۔ ان کا تعارف خیر۔۔۔ آپ بھی سنیے:

آپ کا نام مسٹر سنگھ ہے۔ ایک ادبی اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنا مکان ہے۔ اپنی زمین ہے۔ آٹھویں جماعت میں تھے کہ تعلیم کو خیرباد کہا اور بیٹھاری بن گئے۔ دو سال کے بعد طبیعت اُکھڑی تو خاندانی پیشہ اختیار کیا اور سرکاری گرنتھی مقرر ہو گئے۔ پڑھنے لکھنے کے لیے وقت کافی مل جاتا۔

پڑھائی شروع کی اور پرائیویٹ طور پر باقاعدہ گریجویٹ بن گئے - سرکاری ملازمت
مل گئی اور وہیں دو زبانوں میں ایم اے کیا اور ان میں سے ایک زبان میں ڈاکٹریٹ
کیا - ترقی کی منزلیں طے کرتے ایک یونیورسٹی میں لیکچرر مقرر ہو گئے - کچھ تعلیمی
اداروں کے منتظم اور کچھ سرکاری کمیٹیوں کے ممبر بن گئے - دن بھر پڑھتے اور لکھتے ہیں
کتاب چھوڑنا موت کے برابر سمجھتے ہیں اور شاید یہ موت ہی ان سے کتاب چھڑا سکتی
ہے - خدا پر بہت بھروسہ رکھتے ہیں - اور انھیں کامل یقین ہے کہ سب اسی کی
منشا سے ہوتا ہے - دس گیارہ بچے ہیں جنھیں یہ خدا کی دین سمجھتے ہیں - یہ تو بڑا ہو
فیملی پلاننگ والوں کا جوان پر اثر انداز ہو گیا تھا - میں نے پہلے مسٹر سنگھ اور پھر
ان کے ماحول کو غور سے دیکھا جس چارپائی پر وہ پڑے تھے اس کا قد ان سے چھوٹا تھا -
سرہانے ایک تکیہ تھا جس پر وہ ٹیک لگائے گھٹنوں پر کتاب لیے تھے - بنیان
پہن رکھی تھی جس میں مختلف رنگوں کے اور غالباً مختلف سیاہیوں کے دس
قلم لٹکتے ہوئے اپنی رنگینی دکھا رہے تھے - کمرہ اور الماریاں کتابوں سے اٹی پڑی
تھیں - ان کی چارپائی کے چاروں طرف مختلف زبانوں کے رسالے، اخبارات
کتابیں زمین پر چاروں شانے چت پڑی تھیں - چارپائی کے نیچے پرانے اخبارات
ہوا سے چھپٹا رہے تھے - نزدیک ہی دو تین چائے کی مستعملہ پیالیاں دھری تھیں -
ایک پیالی ٹوٹی پڑی تھی جس میں سے چائے گر کر پھیل گئی اور جم چکی تھی - گھر والوں کو
سخت ہدایت تھی کہ کمرے کی صفائی اس طرح کی جائے کہ کوئی کتاب یا کاغذ کا پرزہ
اپنی جگہ سے ہلنے نہ پائے - اس لیے صفائی یا تو ہوتی ہی نہیں تھی یا پھر بہت مجبوری
حالت میں کی جاتی تھی -

جس کتاب کی ضرورت پڑتی سیدھی نظر وہاں پہنچتی، جہاں کتاب پڑی
ہوتی - ہاتھ بڑھایا، کتاب اٹھائی اور مطلوبہ صفحہ اس طرح نکال لیا جیسے کتاب
ازبر ہو - استعمال کر کے وہیں کہیں رکھ دی جاتی - لیٹے لیٹے پڑھتے تھے - لیٹے
لیٹے لکھتے تھے - چائے آئی، پہلا گھونٹ لیتے ہی لطف آ گیا - معلوم ہوا بہترین

جائے استعمال فرماتے ہیں اور اسے بنانے کے ڈھنگ سے گھر والوں کو مکمل واقفیت دے رکھی ہے۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے جائے کا گھونٹ لیا۔ اُٹھے اور کتاب پر جائے کی پیالی رکھ دی جسے پھر اُٹھانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ معرفت سے تاریخ، فلسفہ سے ادب، ہر موضوع پر گوہر لٹانے لگے۔ بات کا سلسلہ تب ٹوٹا جب دو سکالر تشریف لے آئے۔ ایک صاحب ایک کتاب لینے آئے تھے۔ دوسرے کچھ معلومات حاصل کرنے۔ پہلے صاحب کو ہدایت کی۔ سامنے الماری کھولو نچلے خانے میں دائیں طرف دس بارہ کتابوں کے نیچے پڑی اس نام کی کتاب نکالو اور لے جاؤ۔ دوسرے صاحب کو یونیورسٹی لائبریری میں اس جگہ کا پتہ دیا جہاں وہ کتاب مل سکتی تھی۔ ادھر سے فارغ ہوئے تو گھڑی پر نظر کی۔ فرمانے لگے۔ . "ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ کل اسی وقت پھر بات ہوگی۔"

ہم چلے آئے۔ راستے میں مَیں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ یہ صاحب بہت دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔ فن پر بھی عبور حاصل معلوم ہوتا ہے۔ آپ ان کے بارے میں کچھ اور بتائیے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے۔ . . کہ یہ حضرت اُردو، فارسی، ہندی، پنجابی، انگریزی کے تو ماہر ہیں ہی، گجراتی اور بنگالی پر بھی دسترس حاصل ہے۔ کمی ہے تو بس یہ کہ گھر کے معاملات سے بے نیاز ہیں۔ بازار، آٹا، دال، سبزی لینے کے لیے مجبوراً جاتے ہیں۔ اور راستے میں اگر کوئی دوست یا ادیب مل گیا جن کی کوئی کمی نہیں تو پھر یا تو وہیں گھنٹوں باتیں ہوتی ہیں یا پھر ان کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ اور کہیں رات کے وقت گھر لوٹتے ہیں۔ . . ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ گھر سے پیسے لے کر کپڑا خریدنے نکلے اور راستے میں پتہ لگ گیا کہ لاہور میں ایک علمی کانفرنس ہو رہی ہے اور یہ انھیں کپڑوں میں لاہور پہنچ گئے۔ گھر میں سب ان کی عادت کو جانتے ہیں اور وہ بھی ان کی طرف سے بے فکر ہو گئے ہیں۔ تنخواہ کا بیشتر حصہ کتابوں پر خرچ کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی کتاب مانگ لے کبھی انکار نہیں کرتے۔ واپس مانگتے نہیں۔ اور واپس ہوتی بھی نہیں۔ ضرورت پڑنے پر نئی خرید لاتے ہیں۔ اسی دوران گھر والوں کی چیخ

پکار بھی مزے سے سنتے رہتے ہیں۔

میں اگلے روز وقتِ مقررہ پر پہنچا۔ معلوم ہوا غائب ہیں اور کل کے گئے واپس ہی نہیں لوٹے۔ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے آتے نظر آئے۔ بستر پر دراز ہو گئے اور کہنے لگے . . . "پوچھیے کیا جاننا چاہتے ہیں" . . . میں نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ "آپ کی آمدنی کے کیا ذرائع ہیں"۔ کہنے لگے "تنخواہ محض"۔ میں نے پوچھا "زمین سے کیا ملتا ہے"۔ جواب ملا "زمین مزارعوں کے پاس ہے۔ وہ پیسہ نہیں دیتے۔ میں مقدمہ بازی کی اُلجھن میں نہیں پڑ سکتا"۔ میں نے پھر پوچھا کہ "اس محدود آمدنی میں اتنے بڑے کنبے کا خرچ کیسے چلتا ہے اور جس طرح آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اپنے بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے"۔ فرمانے لگے . . . "شروع میں بچے ایک دو ہی تھے میں نے سوچا میری طرح یہ بھی از خود تعلیم حاصل کریں گے۔ ادھر میرا اپنا خرچ بہت تھا اندازہ تھا کہ آخری وقت کافی رقم جمع کر لوں گا۔ آرام اور بے فکری سے زندگی بسر کروں گا۔ ادبی دُنیا میں نام بھی مل جائے گا۔ غیر ممالک کی سیر بھی کر آؤں گا۔ لیکن غلطی یہ ہوئی کہ ادھر تعلیم بڑھتی گئی اور اُدھر بچے بڑھتے گئے۔ اخراجات میں اضافہ ہو گیا۔ مہنگائی حد سے تجاوز کر گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ بچ نہ پایا۔ اب بچوں کی تعلیم، پرورش، ان کی شادیاں ایسے مسائل ہیں جن سے پریشان ہوں۔ فیصلا اب یہ کیا ہے کہ زمین کو سنبھالوں، خود کاشت کراؤں اور پٹوار کے تجربے کا فائدہ اُٹھاؤں کتابیں مجھے نہیں چھوڑتیں اور کتابوں کو میں چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ کروں تو کیا کروں۔ سرکار سے قرض لے کر ٹریکٹر اور کھاد خریدوں گا۔ اور زمینداری سنبھالوں گا۔ اب چارپائی پر کتاب پڑھتا ہوں پھر ٹریکٹر پہ بیٹھ کر پڑھوں گا"۔ پھر کہنے لگے، "ہر کام اُس کی منشا مبارک سے ہوتا ہے۔ اپنے بس میں کیا ہے۔ یہ بچے بھی اُسی کی دین ہیں"۔ آخر ایک لمبی آہ بھر کر کہنے لگے . . . "بھئی تغیرات ہیں زمانے کے"۔

مُعاوضہ

ہماری بزمِ ادب کی خصوصی میٹنگ میں طے پایا کہ اس سال بھی ہر سال کی طرح ۱۴ اگست کو ایک مشاعرہ منعقد کیا جائے اور شہر کے کلب میں شعرا اور پبلک کو شام سات بجے مدعو کیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ قریب ایک درجن شعرا کو دعوت نامے بھیجے جائیں۔ اور ہر شاعر کو دو صد روپیہ بطور معاوضہ دیا جائے۔ چنانچہ میں نے بطور سیکریٹری بزمِ ادب شعراء صاحبان کو تاریخ، وقت، جگہ اور معاوضہ کے بارے میں تفصیل سے لکھ کر درخواست کی کہ اگر انھیں یہ شرائط منظور ہوں تو وہ فوراً مطلع فرمائیں۔

وقتِ مقررہ پر مشاعرہ شروع ہوا۔ سبھی شعرا تشریف لے آئے تھے۔ مشاعرہ خوب جما اور سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔ تقریب ہر طرح سے خوش اسلوبی سے

سرانجام پائی۔ سبھی شعرا کو معاوضہ دیا گیا۔ لیکن ایک شاعر معاوضہ لینے کے وقت ادھر اُدھر ہو گئے۔ چنانچہ ان کا انتظار کیا جانے لگا۔ جب دیگر شعرا تشریف لے گئے تو آں حضرت تشریف لائے اور محاسب سے دو صد روپیہ لینے سے انکار کر کے کہنے لگے۔ "میں معاوضہ کی رقم پانچ صد روپیہ لوں گا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ میرا مرتبہ دوسرے شعرا سے بلند ہے۔ دوسرے اسی تاریخ میں مجھے ایک اور جگہ سے پانچ صد روپیہ کی آفر بذریعہ تار آئی ہوئی ہے۔ چونکہ آپ کا خط پہلے آگیا تھا اس لیے میں نے وہاں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اور اس خیال سے کہ اس تار کی موجودگی میں آپ مجھے بخوشی پانچ صد روپیہ دے دیں گے، میں یہاں چلا آیا۔ ۔ " شاعر صاحب تار جیب سے نکال کر دکھانے ہی والے تھے کہ محاسب نے انھیں کہا کہ آپ کو اطلاع دی گئی تھی کہ بزم آپ کو دو صد روپیہ دے گی۔ دوسرے شعرا اپنی رقم لے کر چلے گئے۔ آپ کو یہ بھی لکھا گیا تھا کہ آپ ہمیں اطلاع دیں کہ آپ کو ہماری شرائط منظور ہیں۔ جس کا آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاعر صاحب نے کہا۔ ۔ " مجھے اتنی فرصت کہاں۔ میرے پاس مشاعروں کے دعوت نامے آتے رہتے ہیں۔ اسی کام پر گزارہ نہیں ہے۔ میری آمدنی کے وسائل اور ہیں۔ جہاں میرا جی چاہتا ہے چلا جاتا ہوں۔ میں پابند ہو کر کہیں نہیں جاتا۔ لیکن تار ملنے پر میں نے خط کے ذریعے اطلاع دے دی تھی۔ ۔ " محاسب نے کہا کہ۔ ۔ " مجھے تو صرف دو صد روپیہ دینے کا ہی اختیار ہے۔ آپ سیکریٹری بزم سے بات کر لیں۔" چنانچہ وہ میرے پاس آئے۔ اور میرے اور ان کے درمیان وہی بات ہوئی تھی اور ہوئی جو ان کے اور محاسب کے درمیان ہوئی تھی۔ شاعر صاحب پانچ صد روپیہ لینے پر بضد تھے اور تار کو بار بار جیب سے نکال کر لہرا دیتے تھے۔ میں نے کہا چلیے، معاملہ صدر انجمن کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ آخری فیصلہ تو وہی دے سکتے ہیں۔ ۔ " چنانچہ ہم سب صدر صاحب کی خدمت میں پیش ہوئے اور سارا معاملہ ان کے گوش گذار کیا۔ ۔ ۔ صدر نے ساری بات سکون سے سن کر کہا۔

"آپ نے ہمارے خط کا جواب بقول آپ کے اس وقت دیا جب آپ کو کسی اور جگہ سے تار بھی آیا کہ آپ کو پانچ صد روپیہ دیا جائے گا۔ ہمیں وہ آپ کا خط نہیں ملا۔ مگر کیا وجہ ہے کہ آپ نے ہمیں تار کے ذریعے ہی اطلاع کیوں نہیں دی۔ پھر جب آپ کو صاف صاف لکھ دیا گیا تھا کہ معاوضہ کی رقم دو صد ہے تو اس میں ایزادی کا سوال کیسے اٹھا۔ آپ تشریف نہ لاتے یا پھر ہماری منظوری حاصل کر کے تشریف لاتے۔"

"آپ کو خط نہیں ملا۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میں نے خط لکھ دیا تھا حالانکہ میرے پاس وقت کی سخت کمی تھی اور میری نظر میں یہ کافی تھا۔"

"لیکن ہماری مجبوری ہے . . . ہم دو صد روپیہ سے زیادہ معاوضہ نہیں دے سکتے۔"

"لیکن آپ میری مجبوری کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں کہ آپ کے مشاعرہ کے لیے میں نے پانچ صد روپیہ معاوضہ کا دوسرا مشاعرہ چھوڑا۔ چلیے معاملہ کو نپٹانے کے لیے آپ چار صد روپیہ ہی دے دیجیے۔ میں یک صد روپیہ کا نقصان برداشت کر لوں گا۔"

"اچھا یہ بتائیے کہ تار کس جگہ سے آپ کو ملی۔ بھیجنے والے کا نام اور پتہ کیا ہے۔ مشاعرہ کس تاریخ کا تھا اور کس جگہ ہونا قرار پایا تھا۔"

"آپ تار ملاحظہ فرمائیے . . . مشاعرہ ۱۴ اگست کو ہونا قرار پایا تھا۔ بھیجنے والے کا نام درج ہے۔ لیکن تار ہونے کی وجہ سے پتہ اور جگہ کا نام درج نہیں لیکن مجھے بھیجنے والے کا پتہ اور جگہ کا نام معلوم ہے۔"

"مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ مگر ہم اطمینان کریں گے۔ آپ ہمیں تار بھیجنے والے کا پورا پتہ اور اس جگہ کا نام جہاں مشاعرہ ہونا تھا، بتا دیں۔"

"جناب آپ کیوں بحث میں الجھ رہے ہیں۔ لائیے تین صد روپیہ ہی دیجیے اور بات ختم کیجیے . . . میں آیندہ محتاط رہوں گا . . . خواہ مخواہ دو صد روپیہ کا نقصان کر رہا ہوں۔"

"مگر آپ بے فکر رہیں۔ ہم آپ کو اطمینان کرنے کے بعد پانچ صد روپیہ ہی دیں گے۔ آپ تار مجھے دیجیے۔ اور اُس کی تفصیل اس کاغذ پر لکھ کر دے دیجیے۔"

"آپ بھی کمال کر رہے ہیں۔ سُنا تھا کہ بڑے آدمی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال تک نہیں کرتے۔ میرا وقت ضایع ہو رہا ہے۔ اور آپ بیکار اُلجھن میں پڑے ہیں۔"

"میں نے آپ کو کہا نہ کہ دُوسری صُورت میں آپ کو دو صد ہی مل سکتے ہیں۔"

"چلیے دو صد ہی دیجیے۔ قصّہ ختم کیجیے۔ اب آپ سے کیا جھگڑا کروں۔"

"آپ ذرا باہر ٹھہریے، میں ابھی سیکریٹری بزم کو آپ کے ساتھ بھیجتا ہوں۔"

"کیوں صدر صاحب، اس تار میں آپ نے کون سی بات دیکھی جس سے شاعر صاحب دو صد روپیہ ہی لینے کے لیے تیار ہو گئے۔"

"سیکریٹری صاحب آپ بہت بھولے ہیں۔ شاعر صاحب نے اپنے کسی واقف کو لکھا کہ وہ انھیں تار دے دے کہ چودہ اگست کو مشاعرہ ہوگا اور پانچ صد رُوپیہ عوضانہ ملے گا۔ اس نے تار دے دیا۔ اب شاعر صاحب جان گئے کہ میں نے ان کی یہ حرکت بھانپ لی ہے۔ اور اُنھوں نے قانونی چکر سے بچنے کے لیے دو صد ہی لینا منظور کر لیا ہے۔"

"تو صدر صاحب، آئندہ سال اس شاعر کو ہرگز نہ بُلائیے گا۔"

"سیکریٹری صاحب! اس شاعر کو ہم ضرور بُلائیں گے اور تم دیکھو گے کہ اگلے سال یہ کوئی اور اسکیم گھڑ کر لائیں گے۔"

"آئیے، آپ کو محاسب سے رقم دلا دوں۔"

"تو صاحب مَیں نے آپ کی بات مان لی ۔ اور دو صَدی لے لیے ، لیکن مجھے اگلے سال مشاعرہ میں بُلانا نہ بھولیے گا ۔"
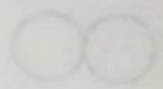
نیاپن

بَات شہر چنڈی گڑھ کی ہے۔ یہ بالکل نیا شہر ہے۔ پہلے اس جگہ بہت دیہات تھے۔ ان میں رہنے والوں کو نکال دیا گیا ہے۔ وہ پُرانے تھے۔ شوالک کی پہاڑیوں کے دامن میں یہ سہانی جگہ ایک نیا شہر بسانے کے لیے منتخب کی گئی اور اس نئے شہر کا نقشہ بنانے اور اسے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک غیر مُلک سے آرکیٹیکٹ بلایا گیا۔ یہاں ہر چیز نئی ہے۔ جو یہاں آ چکے ہیں وہ نئے ہیں جو آ رہے ہیں وہ نئے ہیں۔ جو آئندہ آئیں گے وہ بھی نئے ہوں گے۔ یہاں میں بھی نیا آیا ہوں۔ اس نئی جگہ کو دیکھنے کے لیے بیرون جات سے لوگ آتے ہیں مُلک کے دُور دراز حصّوں سے آتے ہیں۔ اور ان میں سے بہت سے یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میں اس کے نئے پن سے بہت متاثر ہوا ہوں اور اپنا یہ نیاپن کا نیا

مضمون تے چینڈی گرڈھ کی نذر کرتا ہوں۔

میں نے اس شہر میں نئے چہرے دیکھے۔ ان پر نئے سر دیکھے۔ ان پر نئے بال دیکھے۔ کلیوں سے آراستہ بال، پھولوں سے پیراستہ بال، گجروں سے سجے بال۔ آسمان کو چھونے کے لیے بے تاب بال، زمین کو چومنے کے لیے بے قرار بال، لٹوں میں لٹکتے بال، شانوں پر پریشان بال، ناگن کی طرح بل کھاتے بال، انھیں نہایت خوبصورتی سے اور نہایت شوق سے ترتیب دیا گیا تھا یا پریشان کیا گیا تھا۔ ایک ایک بال کی کھال اُتاری گئی تھی اور بال بھر بھی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی انھیں بنانے سنوارنے، پریشان کرنے یا بگاڑنے میں کتنا وقت لگا ہوگا۔ کتنی محنت کی گئی ہوگی۔ کتنے قیمتی لمحات صرف ہوئے ہوں گے۔ کتنی نئی ایکٹریسوں اور ایکٹروں کے نئے بالوں کی کتنی نئی قسمیں ملاحظہ کی گئی ہوں گی۔ کتنے نئے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ کتنے نئے میگزین نظر سے گزرے ہوں گے۔ کتنے نئے بیوٹی سیلونز کے چکر لگے ہوں گے کتنے نئے پھول اُگائے گئے ہوں گے۔ کتنی نئی کلیاں کھلائی گئی ہوں گی کتنی ریسرچ کی گئی ہوں گی۔ کتنے نئے اور مختلف چھوٹے اور بڑے آئینوں نے اپنے نئے فیصلے دیے ہوں گے۔ اور ان کے بنے سنورنے اور نکھرنے کے بعد اور ان کی نمائش سے پہلے کتنی نئی رائیں لی گئی ہوں گی۔ کتنے نئے مشورے ہوئے ہوں گے۔ کون جانے ہاں ایک بات مسلمہ ہے کہ ان میں ایک نیا پن ہے۔ ایسا نیا پن جسے دیکھتے ہوئے میں کئی بار بال بال بچا ہوں۔ جب خدا کی یہ خاص مخلوق چلتی ہے تو نئی چال سے۔ ان کی مسکراہٹ نئی۔ ان کی ہنسی نئی۔ ان کے قہقہے نئے۔ ان کی ہر بات میں رنگینی ہوتی ہے۔ ایک جدت لیے ہوئے۔ ایک نئی سوجھ بوجھ لیے ہوئے جسے دیکھنے کے لیے سمجھنے کے لیے، پرکھنے کے لیے اور اپنانے کے لیے جہاں نئی قسم کے نئے منچلے نئی نئی سڑکوں پر نئے نئے چکر لگاتے ہیں۔ نئے ریستورانوں میں نیا اُدھار مانگ کر نئی کافی پیتے ہیں۔ وہاں نئے ادیب، نئے شاعر، نئے نامہ نگار اپنے نئے مضامین مرتب کرتے ہیں اور اپنی زندگی کے لیے نئی آمدنی کا نیا ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔

ان کے نئے نئے ہاتھوں کی نئی نئی انگلیاں دیکھیے۔ لمبے ناخنوں والی انگلیاں، ناخن تراشیدہ انگلیاں، جن پر وہ رنگ چڑھا ہے جو ان کے نئے چہرے کا رنگ ہے۔ ان کے ماتھے کی بندی کا رنگ ہے۔ وہ بندی جس کا سائز بنانے میں اتنی ہی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ جتنا بال بنانے میں ان کی نئی لپ اسٹک کا لگا ہونٹوں کا رنگ ہے۔ ان کی نئی گھٹی قمیض کا رنگ ہے۔ نئی چست شلوار کا رنگ ہے۔ ان کی نئی مہین ساڑی کا رنگ ہے۔ نئے مختصر سے بلاؤز کا رنگ ہے۔ وہ بلاؤز جو پیٹھ سے بے نیاز ہے۔ جو آدھے جسم سے بے نیاز ہے۔ جوان کی نئی جوتی کا رنگ ہے۔ وہ جوتی جو نئے نائلون کے اسی رنگ کے رنگے تاگوں سے بنائی گئی ہے۔ اور جس میں سے اسی رنگ کی رنگی انگلیاں اپنا رنگ دکھا رہی ہیں۔ نیا لباس، نیا میک اپ "نئی صبح نیا،" "نئی دوپہر نیا،" "نئی شام" نیا، "نئی رات" نیا۔

یہاں پر ہر بات نئی ہے۔ ملنا نئے طریقے سے، بچھڑنا نئے طریقے سے، نئے ناچ نیا سُر، نئے ریکارڈ، جنھیں ماں باپ، بھائی بہن، میاں بیوی اپنے نئے نئے دوستوں کے ساتھ اکھٹے نئے کمرے میں نئے صوفوں پر نئے انداز سے بیٹھ کر سنتے ہیں مسکراتے ہیں، ہنستے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں۔ کچھ جھینپتے ہیں۔ لیکن شرماتے بالکل نہیں۔ کیونکہ شرم پرانی چیز ہے۔ جو انھوں نے چھوڑ دی ہے۔ نئے گانوں کے ساتھ نئی سیٹیاں بجتی ہیں۔ نئے پاؤں اُٹھتے ہیں۔ ان میں نئی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اور نیا موقع ملنے پر نئے ناچ کی نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ نئی ماں ہنستی ہے۔ نیا باپ ہنستا ہے۔ نیا کمرہ کھِل کھِلا اُٹھتا ہے۔ سینماؤں میں گائے ہوئے نئے گانوں کو سننے کی فرمائشیں ہوتی ہیں۔ نئی واہ واہ ہوتی ہے۔ نئے نئے ہاتھوں سے نئی نئی قسم کی نئی نئی تالیاں بجتی ہیں۔ نیا پیار پیدا ہوتا ہے۔ کیا جاتا ہے جسے ماں باپ اپنی پرانی آنکھوں سے دیکھنا غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ نیا رنگ، نیا ماحول، نئی فضا نیا نکھار، "نئی صبح نیا،" "نئی دوپہر نیا،" "نئی شام" نیا،" "نئی رات" نیا۔

میں اس ماحول میں پل رہا تھا۔ رنگ چڑھتا تھا چڑھ گیا۔ دل نے آواز

دی۔ ۔ ۔ "تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا۔ ۔ ۔" سیدھا گھر پہنچا۔ پرانی بیوی کو نئی آواز سے، نئے انداز سے، نئی کشش سے، نیا بنتے اور نیا بنانے کے لیے نئی محبت سے اور نئے ڈر سے پکارا۔ ۔ ۔ "ڈارلنگ!" بیوی نے جو میری پرانی قمیض میں پرانے تاگے سے اور پرانی سوئی سے ایک پرانا بٹن ٹانک رہی تھی نظر اٹھا کر نہیں، اچٹتی نظر سے بھی نہیں پوچھا۔ ۔ "آپ کیسے پکار رہے ہیں۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں۔ ۔" دل کو خفیف سا دھکا لگا۔ میں نے بڑے تپاک سے پوچھا۔ ۔ ۔ "آپ نے چنڈی گڑھ دیکھا ہے؟" ۔ ۔ ۔ "دیکھا ہے؟" بیوی نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ۔ "تو آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے اور ہر چیز میں نیا پن آ گیا ہے۔ کیا ہم اسی گھسی پٹی زندگی میں ہی رہیں گے۔ کیا ہمیں نہیں بدلنا چاہیے۔ ۔ ۔"

"ضرور بدلنا چاہیے۔ لیکن نیا بننے کے لیے نئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ۔" بیوی نے آہستہ سے اپنی پرانی ساڑھی کا پرانا آنچل پرانے انداز سے پکڑتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ اس مسکراہٹ میں شرارت تھی۔ لیکن شرارت نئی نظر آئی۔ اس لیے بہت پسند آئی۔ میں نے کہا:

"یہ مسئلہ بعد میں سوچا جا سکتا ہے۔ اسے نئے وقت میں نئے طریقے سے اور نئے نظریے سے سوچیں گے۔ آج تو ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کیسے بدلیں۔ ہم نئے کپڑے لائیں گے۔ نئے خیالات لائیں گے۔ ہم سب سامان لائیں گے، ادھار لائیں گے، مانگ کر لائیں گے، خرید کر لائیں گے۔ ہم چاند پر بھی جائیں گے۔ اس کے لیے اپنی نئی سیٹ ریزرو کرائیں گے۔ کام بہت کرنا ہے۔ وقت بہت تھوڑا ہے۔" بیوی نے پوچھا:

"چنڈی گڑھ میں تو نیا پن بہت سالوں سے ہے۔ یہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے۔" پھر معنی خیز نظروں سے دریافت کیا۔

"کیا چنڈی گڑھ میں پاگل خانہ بھی بن رہا ہے . . ." سمجھنے کو تو میں سمجھ گیا۔ مجھے اشارۃً یا کنایتاً پہلے بھی پاگل کہا گیا تھا۔ لیکن وہ کہنے والے کچھ پرانے قسم کے لوگ تھے جنھیں میں نے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن بیوی کو چھوڑنا مشکل تھا۔ پھر اسے نیا بنانے کی تمنّا تھی۔ اس لیے غصہ پی گیا۔ آخر اس کی رضامندی سے نیا پروگرام بن گیا . . . نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

ہم چل پڑے، نئے سکوٹر میں، سکوٹر والا بھی نیا تھا۔ اس نے پوچھا:

"صاحب کہاں چلو گے؟"

صاحب کا لفظ پہلی بار سُن کر ہماری رگِ حمیت پھڑک اُٹھی تھی۔ ہم نے تمکنت سے کہا:

"سترہ سیکٹر چلو۔"

سکوٹر والے کو نہ جانے ہمارے دل کی بات کا کِس طرح پتہ لگا۔ سیدھا آرائش و زیبائش کے سامان کی سب سے بڑی دُکان پر لے گیا۔ ہم نے اس کے ہاتھ پر دس رُوپے کا نوٹ تھما دیا۔ جو ہم نے اپنے نئے پڑوسی سے نئی چالاکی سے نیا اُدھار لیا تھا۔ اسکوٹر والے نے جیب سے ایک ایک رُوپے کے سات نوٹ نکالے اور بار بار گِن کر کہنے لگا:

"صاحب ایک رُوپیہ کم ہے۔"

ہمیں اس کی چالاکی پسند آئی۔ نوٹ نئے تھے۔ ہم نے منظور کیے۔ سکوٹر والے نے تپاک سے شکریہ ادا کیا۔ جو ہم نے پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔ کیونکہ ہم نے شکریہ کہنے کا موقع کسی کو نہیں دیا تھا۔ ہم نئی دُکان پر نئی چال سے چلنے کو ہی تھے کہ بیوی نے پوچھا:

"شروعات کس چیز سے کرو گے؟"

میں نے کہا . . . "سر کے بالوں سے۔ دیکھتی ہو میرے سَر کے بال سفید ہونے لگے ہے۔ انھیں کالا بنانا ہے۔ چمکیلا اور دمکیلا بنانا ہے۔ فی الحال یہ

دریافت کریں گے کہ آخری ریسرچ کے مطابق کون سی نئی چیز بازار میں آئی ہے۔ پھر اس پر ریسرچ کریں گے۔"

بیوی کو نہ جانے کیا سُوجھی، میرے کان میں آہستہ سے کہنے لگی :

"آپ کی بھویں بھی سفید ہونے لگ گئی ہیں۔ کیا ان کو بھی کالا کرو گے۔ یعنی مُنہ بھی کالا کرو گے۔ بیوی کی اس نئی بات سے مجھے ایک نیا چکر آیا۔ مجھے یہ بات بالکل سُوجھی ہی نہیں تھی۔ میں نے فوراً بیوی سے رخصت لی اور چل پڑا جھیل کی طرف۔ ڈوبنے کے لیے نہیں، سوچنے کے لیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت سوچا۔ پُرانے ڈھنگ سے سوچا، نئے ڈھنگ سے سوچا۔ جو ڈھنگ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ اس سے سوچا۔ آج تک سوچتا چلا آ رہا ہوں۔ شروعات میں ہی مصیبت طاری ہو گئی۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن . . . اس اُدھیڑ بن نے میرے بال بالکل سفید کر دیے ہیں۔ میرے ساتھیو! اس نئی مصیبت میں میری مدد کیجیے۔ شاید آپ کو بھی اس مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ میں نیا بن جاؤں اور منہ کالا نہ ہو۔ اب بتا سکیں تو بہتر، ورنہ سوچیے اور اپنا نیا مشورہ دیجیے۔ ہو سکتا ہے اسی اثنا میں مجھے بھی کوئی نیا حل سوجھ جائے۔

خدا اور انسان

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور اب جبکہ ہوش ختم ہونے کو آرہا ہے۔ ایک ہی بات سُنی ہے اور وہ یہ کہ:

"تعریف اُس خدا کی جس نے جہاں بنایا"

خدا نے جہاں کیوں بنایا۔ اس کے بنانے سے اس کی کیا غرض تھی۔ اس سے اُسے کیا فائدہ پہنچا۔ . . یا اس نے یہ مصیبت کیوں مول لی۔ خدا کون ہے، اس کی مستقل رہائش کہاں ہے اور عارضی قیام کس کس جگہ ہوتا ہے۔ وہ اب کیا کرتا ہے۔ اس کی عمر اس وقت کتنی ہوگی۔ ان باتوں پر آج غور نہیں ہوگا۔ البتہ جس جہان کو اس نے بنایا ہے اور جس کے لیے اس کی تعریف کی جائے اس کا مختصر سا ذکر کرنے سے پہلے، آئیے خدا کی تعریف کریں کیونکہ وہ اپنی تعریف سُننے کا خواہش مند ہے اور

الہامی صحیفوں میں سب سے پہلے یہی بات اُس نے لکھوائی ہے۔

خدا خلّاقِ عالم ہے۔ اس کا سب سے اہم کارنامہ انسان کی تخلیق ہے۔ اس نے انسان کو اپنی شکل میں تشکیل کیا۔ اسے اشرفُ المخلوقات بنایا۔ اس انسان کا سب سے پہلا کارنامہ تھا خدا کی حکم عدولی۔ خدا نے ناراض ہو کر اسے گھر سے نکال دیا۔ اس انسان سے انسان نے جنم لیا اور انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا چاند پر پہنچ گیا۔ تہذیب و تمدّن کا علم بردار بن گیا۔ اسی انسان نے انسانیت کا خون کیا۔ انسان کا خون پیا، خون گرایا، خون بہایا، خون کا خون کیا۔ ہڈیاں توڑیں، عصمت دری کی، عصمت فروشی کی، ننگے جلوس نکالے۔ معصوم بچّوں کو نیزوں پر لٹکایا۔ بہنوں کی بھائیوں کے سامنے اور ماؤں کی بیٹوں کے سامنے آبرو ریزی کی۔ معصوم بچّوں کو چُرایا۔ اُن کو چھپا کر رکھا، بھوکا ننگا رکھا۔ ان کی آنکھیں پھوڑیں، چہرہ مسخ کیا —— اعضا توڑے اور باقاعدہ ٹریننگ دے کر انھیں دربدر بھیک مانگنے پر مجبور کیا۔ اور بھیک لانے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ ان کے والدین کو، رشتہ داروں کو بلکنے اور تڑپنے چھوڑ دیا۔ بھولی بھالی معصوم بچیوں کو بہکا کر، پھسلا کر، دھمکا کر زبردستی اُٹھا کر گھر سے بے گھر کیا۔ انھیں عمدہ خوراک، عمدہ لباس دیا۔ ناچ، گانا سکھایا۔ ہتھکنڈے سکھائے تاکہ وہ بستے گھروں کو اُجاڑ سکیں۔ ان کا مال و متاع سمیٹ کر اپنے قبضے میں کر سکیں۔ اس انسان نے انسان کو اپنا کہہ کر اس کا سب کچھ ہتھیا لیا۔ دوست کہہ کر اس کا سب کچھ چھین لیا۔ اس کی پیٹھ میں چھُرا گھونپ دیا۔ اس انسان کو ماں بیٹی اور بہن کی عزّت لوٹنے میں حیا نہیں آئی۔ اور کسی اور کی ماں، بہن، بیٹی کو اپنی ماں، بہن، بیٹی کہہ کر عصمت لوٹنے میں شرم نہیں کھائی۔ اس انسان نے کسی دوشیزہ کے چہرے پر اس لیے تیزاب پھینکا کیونکہ وہ اپنی ہوس کی آگ کو نہ بجھا سکا۔ سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے انسان کو۔ اپاہج کو دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ خود نرم اور گرم گدیلو میں سو کر انسان کو ہی اپنی حفاظت کے لیے معمولی اور سرد کپڑوں میں جاگنے پر مجبور کیا۔ خوراک میں، دوائیوں میں زہر ملایا۔ مٹّی کے تیل میں مٹّی کا پانی ڈالا اور

دونوں کو مٹی بنا دیا۔ انسان شراب میں دُھت ہو کر گاڑی چلاتا ہے اور کسی بچّے یا بوڑھے کو کچل کر بھاگ جاتا ہے۔ اس انسان نے قحبہ خانے، قمار خانے، شراب خانے زنا خانے، سیہ خانے قایم کیے۔ طوائفوں کے اڈے، چور بازاری کے اڈے، رشوت ستانی کے اڈے، جرائم کے اڈے رائج کیے۔ ان کے برانچ اور سب آفس کھولے۔ اس انسان نے ناچ گھروں میں انسان کو ننگا کیا۔ اور ننگ و ناموس کی حفاظت کرنے والے اس انسان نے خود ننگا ہونا شروع کیا۔ اس انسان نے ایٹم بم بنائے۔ زہریلے ہتھیار بنائے۔ شہر تہس نہس کیے۔ بستیاں جلائیں۔ ہرے بھرے کھیتوں کو آگ لگائی۔ یتیم بنائے۔ اپاہج بنائے۔ یہ انسان ہلاکو بنا۔ چنگیز بنا، نادر بنا، ہٹلر بنا، سینہ زور بنا، سیہ کار بنا۔ اور یہ انسان عیّار، مکّار، بدکار، غدّار، گنہگار بنا، کینہ ساز، زمانہ ساز، دغا باز بنا۔ اس انسان نے مفید جانوروں کو کھایا، سانپوں چوہوں تک کو نہ چھوڑا۔ یہ انسان گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گنہگار بنانا جانتا ہے۔ قتل کر کے بری ہونا جانتا ہے۔ بری ہو کر پھر قتل کرتا ہے اور اپنی جگہ کسی اور کو پھانسی پر چڑھاتا ہے اور یہ انسان خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ انسان کو کس نے ایسا بنایا اس پر ریسرچ نہیں ہوئی۔ حیرت کی بات ہے کہ خدا کے بنائے ہوئے ادنیٰ کیڑے مکوڑوں پر دن رات سر کھپائی ہوتی ہے۔ لیکن خدا کی شکل لیے ہوئے انسان کے بارے میں کوئی سوچتا ہی نہیں۔ شاید اس لیے کہ سوچنے والا بھی انسان ہی ہے۔ خدا کی اس شاندار تخلیق میں ایک وجود سوتیلی ماں کا ہے۔ کاش خدا کی ماں سوتیلی ہوتی۔

خدا رزّاقِ عالم ہے شیر اور چیتے جیسے خونخوار جانوروں کو رہنے کے لیے جنگل دیے ہیں۔ ان کی خوراک کا وہیں انتظام کیا ہے۔ انھیں طاقتور بنایا ہے تاکہ وہ ناتواں جانوروں کو دبوچ سکیں۔ انھیں تیز پنجے اور نوکیلے دانت عطا فرمائے ہیں تاکہ وہ شکار کی کھال اُدھیڑ سکیں۔ اس کا جسم مزے لے لے کر کھا سکیں۔ خون پی سکیں۔ بڑی مچھلیوں کے لیے چھوٹی مچھلیاں اور مگرمچھوں کے لیے دریائی جانور ایک ہی جگہ پیدا

کیے ہیں۔ کتوں کے لیے بلیاں، بلیوں کے لیے چوہے، سانپوں کے لیے مینڈک، ایک ہی جگہ مہیا کیے ہیں۔ بلیوں کے پاؤں میں اسپنج لگایا۔ آنکھوں میں خاص قسم کی روشنی بخشی تاکہ وہ اندھیرے میں دودھ پی سکیں۔ دہی گرا سکیں، مکھن خراب کر سکیں۔ کبوتروں مکوڑوں کو سونگھنے کی طاقت عطا کی۔ آسمان میں اُڑنے والے جانوروں کو آسمان میں ہی خوراک بخشی۔ ان کو جھپٹنا سکھایا۔ تاکہ وہ بچوں کے ہاتھ کی روٹی، حلوائی کی دکان پر پڑی مٹھائی اور قصاب کی دکان پر پڑا گوشت اُڑا لے جائیں مچھروں، مکھیوں، پسوؤں کو انسان کا خون پینا سکھایا۔ حکومت تک کو ان کی فیملی پلاننگ کا خیال نہیں آیا۔ انسان کے لیے کھیت کھلیان سے رزق مہیا کیا۔ انسان انسان کو کھاتا ہے۔ جانوروں کو کھاتا ہے۔ جانور، جانور کو کھاتا ہے۔ انسان کو کھاتا ہے۔ دونوں چھینا جھپٹی سے کھاتے ہیں۔ دونوں سرقہ کر کے کھاتے ہیں۔ دونوں آنکھ بچا کر، آنکھ چرا کر، آنکھ دکھا کر، آنکھ نکال کر کھاتے ہیں۔ خدا سب کا رزاق ہے۔ وہ جب چاہتا ہے انسان کو حیوان کو خوراک کا محتاج کرتا ہے۔ بھوک سے تڑپتے، پیاس سے پریشان انسان کو حیوان کو اجل کے منہ میں پھینک دیتا ہے کیونکہ اجل کا رزاق بھی خدا ہے۔

خدا عادل ہے اس نے خود انصاف کرنے کی بجائے غیر تعلیم یافتہ، قدرے تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ لوگ تعلیم یافتہ لوگوں پر تعینات کیے ہیں۔ جو قانون نہیں جانتے مگر قانون بناتے ہیں اور اپنی منشا کے مطابق قانون میں رد و بدل کرتے ہیں۔ خدا لامحدود ہے لیکن نہ جانے اُس نے دنیا کی ہر چیز کیوں محدود کر رکھی ہے۔ یہاں تک کہ میرا یہ مضمون بھی۔

خدا مصلح کل ہے وہ آسمانی صحیفے اُتارتا ہے جن کے معنی تراشنے میں، پنڈت، مُلا پادری سر پھٹول کرتے ہیں اور وہ اُن میں صلح کرانے کی بات تک نہیں کرتا۔

خدا بے نیاز ہے۔ اسے پتہ ہے کہ کمیونسٹ اس کا نام جڑ سے اُکھاڑنے کو تیار ہیں۔ کمیونلسٹ اس کے نام پر خون کی ہولی کھیلتے ہیں۔ سوشلسٹ، اس کے

اپنے بندوں کی تجوریاں لوٹتے ہیں اور ان میں بانٹنے کے لیے سرگرداں ہیں جنھیں وہ حقدار ہی نہیں سمجھتا۔ سب کو اپنی منشا کے مطابق کام کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔

مندروں کے گھڑیال پوری آواز سے اس کو آوازیں دیتے ہیں۔ مسجدوں میں مؤذن اسے چیخ چیخ کر بلاتے ہیں۔ کلیساؤں کے گھنٹے فضا میں ٹکراتے ہیں تاکہ خدا کے کانوں تک آواز پہنچ جائے مگر خدا پھر بھی نہیں آتا۔ اس کے نام پہ بے گناہ قتل ہوتے ہیں۔ بستیاں برباد کی جاتی ہیں اور خدا کے نام پر مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ صدیوں سے یہ عالم چلا آ رہا ہے۔

کچھ کی نظر میں خدا ایک مقام پر رہتا ہے۔ کچھ کا کہنا ہے وہ سب جگہ ہے۔ کچھ اس کا وجود سرے سے ہی ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ صدیوں سے یہ تماشہ ہو رہا ہے اور خدا یہ تماشہ دیکھتا رہا ہے۔ دیکھ رہا ہے اور غالباً دیکھتا ہی رہے گا۔ چلیے خدا کی تعریف میں کہتے ہوئے چلیں:

بڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں پنڈت ہزاروں مُلّا کروڑوں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر، خدا کی باتیں خدا ہی جانے
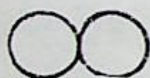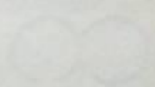
جس طرح آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا اسی طرح یہ بھی آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ شاعر پہلے پیدا ہوا یا مشاعرہ۔ حیرت تو یہ ہے کہ ماہرینِ تحقیقات یہ بھی معلوم نہیں کر سکے کہ مشاعرہ کی تاریخِ پیدائش، وقتِ پیدائش اور مقامِ پیدائش کیا ہے۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ادنیٰ کیڑے مکوڑوں کی تحقیقات پر تو زرِ کثیر صرف کیا جا رہا ہے لیکن اس مسئلے پر جس سے لاکھوں شاعروں اور مشاعروں کی زندگی وابستہ ہے کوئی بات ہی نہیں کی جاتی۔ نہ شاعروں اور مشاعروں کی طرف سے کوئی ایجی ٹیشن ہوتی ہے۔ آئیے اس طویل مضمون کے ایک پہلو پر غور کریں۔

پہلے مشاعرے زبان اور ادب کی خدمت کے لیے منعقد ہوتے تھے۔ زبان کا لطف لیا جاتا تھا۔ ادب کو نکھارا جاتا تھا۔ مشاعرہ کے انعقاد یا صدارت کے لیے کسی

مستند اور بزرگ شاعر کو بلایا جاتا تھا۔ عام طور پر مشاعرہ طرحی ہوتا تھا۔ شعرا حضرات ردیف و قافیہ کی پابندی سے اپنے دماغ سے اپنا ہی شعر نکالتے تھے۔ کبھی کبھی فی البدیہہ شعر فرماتے تھے۔ اچھے شعر پر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ مباحثے اور مناظرے ہوتے تھے۔ تنقید ہوتی تھی۔ سامعین فیض یاب ہوتے تھے۔ بتدریج سننے، سمجھنے اور خود کہنے کا شعور حاصل کرتے تھے۔ مشاعرہ وقتِ مقررہ پر شروع ہوتا تھا۔ شعرا حضرات کو علم عروض پر عبور حاصل ہوتا تھا۔ کلام پر بارہا نظرِ ثانی کرتے تھے۔ جو کلام ایک بار سنا لیتے تھے بجز فرمائش دوبارہ نہیں سناتے تھے۔ اب مشاعرے محض تفریحِ طبع کے لیے ہوتے ہیں کسی بڑے شخص یعنی لیڈر کو مشاعرے کے افتتاح یا صدارت کے لیے دعوتِ خاص دی جاتی ہے۔ یہ حضرت وقتِ مقررہ سے ایک آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں۔ بلانے والوں کو اپنے کام سے اور ان کو اپنے نام سے غرض ہوتی ہے۔ انھیں مشاعروں میں پھولوں سے لاد کر لایا جاتا ہے اور اُن کے تشریف لانے سے لے کر تشریف لے جانے تک ان کی تصاویر کھینچی جاتی ہیں۔ مشاعروں کے لیے اگر مصرع طرح دیا گیا ہو تو کچھ شاعر طرح دے جاتے ہیں۔ کچھ بے طرح سناتے ہیں۔ کچھ پرانے دیوانوں اور جریدوں سے مصرع طرح کی مناسبت اور وزن کی مطابقت سے اشعار نقل کرتے ہیں اور ان میں ایک آدھ شعر اپنا شامل کرتے ہیں۔ کچھ لکھوا کر لاتے ہیں۔ ہر شعر پر دادِ سخن کے طلب گار ہوتے ہیں۔ مباحثے اور مناظرے بند ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اختلاف اور انتشار بعض اوقات جوت پیزار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ تنقید کا کام ڈکشنری تک محدود رہ گیا ہے۔

پہلے مشاعرے کچھ آداب رکھتے تھے۔ خاص موقعوں پر محفلیں منعقد ہوتی تھیں خاص لباس میں ملبوس ہو کر آنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ جن میں شعر کہنے کا شعور اور شعر سمجھنے کی صلاحیت ہوتی تھی۔ انھیں کو محفل میں باریابی کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ اب کسی کا جنم دن ہے تو مشاعرہ، کوئی خوشی کی بات ہے تو مشاعرہ۔ بارات روانہ ہونے سے پہلے مشاعرہ، بارات کی واپسی پر مشاعرہ۔ سننے والوں کو پکڑ کر لایا جاتا ہے

اور سُنانے والے اپنا کلام سُنانے کے لیے بیتاب رہتے ہیں۔ مثلاً:

"تانگے والے یونیورسٹی کیمپس چلو گے۔"

"جی ہاں۔"

"کیا لو گے؟"

"جی ایک روپیہ۔"

"دیکھو ہم تمھیں دو روپیہ دیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ راستے بھر تمھیں ہماری نئی غزلیں سُننی ہوں گی۔"

پہلے مشاعروں میں ناظم مشاعرہ مبتدی شعراء کو پہلے بلاتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ضرورت کے مطابق لب و لہجہ درست کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد مُستند شعراء کو اور سب سے آخر میں مسلّمہ استادِ فن کو درخواست کی جاتی تھی۔ میر محفل مشاعرہ میں رنگ بھرتا تھا۔

'تو بھی بدل فلک کہ زمانہ بدل گیا'

اب میر محفل نے اپنا سکّہ جمانا شروع کر دیا ہے۔ یہ صاحب اسٹیج پر بیٹھتے ہیں تو اکڑ کر۔ اُٹھتے ہیں تو نخروں سے۔ مائک پر جاتے ہیں تو بل کھاتے ہوئے۔ کبھی ایسے شعراء کو جن کا کلام معمولی ہو ایسے وقت میں پیش کرتے ہیں جب محفل جمی ہوئی ہو اور وہ شعراء کلام کی داد پا لیتے ہیں۔ کبھی کسی مُستند شاعر کو اس وقت بُلاتے ہیں جب محفل اُکھڑ رہی ہو۔ اور محفل کے ساتھ ان کا کلام بھی اُکھڑ جاتا ہے۔ کچھ چالاک شاعر ناظم محفل کو شروع میں ہی گانٹھ لیتے ہیں۔ یعنی اب شاعر شعر کہنے کے لیے پاپڑ بیلتا ہے۔ شعر سُنانے کے لیے موقع ڈھونڈتا ہے۔ اور داد حاصل کرنے کے لیے ترکیبیں سوچتا ہے۔

پہلے بھی مشاعروں میں خواتین شعراء شامل ہوتی تھیں۔ اب بھی شامل ہوتی ہیں لیکن اب شاعرات کا گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ شاعرات کو مشاعروں میں بُلانا مشاعروں کی کامیابی کی گارنٹی سمجھا جانے لگا ہے۔ کچھ شاعرات تو ایسی ہیں جو جاذب نظر ہیں۔ خوش الحان ہیں۔ اِدھر اُنھوں نے ترنم سے غزل شروع کی ادھر یوں لگنے لگا

جیسے غزل خود غزل پڑھ رہی ہے ۔ سامعین کی آنکھیں شاعرہ پر اور کان اس کی سُریلی آواز پر ہوتے ہیں۔ مکرر، مکرر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ منتظمین حالات کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ چالاک منتظمین مشاعرے سرکاری عطیہ جات سے کرتے ہیں۔۔۔

مشاعرہ باز پیدا ہو گئے ہیں ۔ چار شاعر بُلا کر آل انڈیا مشاعرہ منعقد کرتے ہیں۔

حضرات بات مشاعرہ کی چل رہی ہے اب آپ مشاعرہ سماعت فرمائیں۔

تُو کون مَیں خوامخواہ

تُو کون مَیں خواہ مخواہ ایک محاورہ ہے۔ یہ محاورہ کس نے ایجاد کیا۔ کب ایجاد ہُوا۔ کن حالات میں اس کی پیدائش ہوئی۔ اس کے بارے میں بہت سُراغ لگایا گیا۔ مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ سب سے بڑی لے کر سب سے چھوٹی لغات دیکھی، کہیں ذکر نہ ملا۔ علمائے سے پتہ لیا مگر لاحاصل۔ مدبّرین کو خط لکھے لیکن سب بیکار گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ محاورہ کسی منچلے کے دماغ کی اختراع ہے۔ وہ منچلا کون تھا۔ کسی مُلک یا شہر کا باشندہ تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں لگ سکا۔ اُمید تو نہیں کہ پتہ چلے مگر ہماری کھوج جاری ہے۔

آئیے آپ کو اپنے ایک دوست سے ملائیں۔ ان کا نام تجویز کرنے سے پہلے ان کے والدین نے مختلف شہروں کے مختلف اسکولوں سے طلبا کے ناموں کی فہرستیں منگوائیں دانش وروں کی ایک کمیٹی نے آٹھ نام چھانٹے۔ ایک نام کا فیصلہ کرنے میں ممبروں کا اختلاف

تھا۔ آخر قرعہ ڈالا گیا۔ پرچہ ہمارے دوست سے ہی اٹھوایا گیا۔ چنانچہ جو نام نکلا وہ ان کا نام تجویز ہوا۔ اسکول پہنچے۔ پڑھنے میں ہوشیار تھے۔ استاد سوال اردو میں پوچھتے تو یہ جواب انگریزی میں دیتے اور انگریزی میں پوچھتے تو جواب ہندی میں دیتے۔ ان کی عادات اور حرکات کو دیکھ کر ان کا نام علامہ پڑ گیا۔ اصل نام لوگ بھول ہی گئے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھی یاد نہیں آ رہا۔ کالج پہنچے، تعلیم حاصل کرنے میں جٹے رہتے۔ دوستوں کو بتاتے تھے کہ اب وہ ہمہ داں ہو گئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کرتے کہ شاعری ہو یا نثر نگاری، ظرافت ہو یا مزاح نگاری، انشائیہ ہو یا غنائیہ، نغمہ ہو یا کرشمہ، ادب ہو یا فلسفہ، سائنس ہو یا تصوف، تحقیق ہو یا تدقیق، اصل ہو یا ترجمہ، تالیف ہو یا تصنیف، تفسیر ہو یا تشریح، حکمت ہو یا تدبیر، تقریر ہو یا تحریر، نقاشی ہو یا مصوری، وہ سب پر حاوی ہو چکے ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ دو دانشور بات کر رہے ہوتے، یہ کھٹک جاتے۔ ان کی بات چپکے سے سنتے اور اچانک ان کے پاس پہنچ کر اپنا نظریہ بتا دیتے بلکہ فیصلہ سنا دیتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو لوگ "تو کون میں خواہ مخواہ" کہنے لگ گئے اور یہ لقب ان کو ایسا ملا کہ لوگ ان کا نام تو بھول ہی چکے تھے۔ انھیں علامہ کہنا بھی چھوڑ گئے۔ اور یہ لقب ہی ان کا نام بن گیا۔

بڑی بڑی محفلوں میں پہنچ جاتے۔ حالانکہ منتظمین کی یہی خواہش ہوتی اور کوشش رہتی کہ وہ محفل میں تشریف نہ لائیں اور جب سوالات کا سلسلہ شروع ہوتا تو ایسے سوال کرتے جن کا مضمون سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور جب محفل میں ہنسی کا فوارہ چھوٹتا تو فرماتے۔ ایسے سوال وہی شخص کر سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع ہو جس نے دنیا کا علم جانا ہو اور سمجھا ہو جس طرح سوال کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح سوال سمجھنا بھی ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ محفل کے اختتام پر چائے پر پہنچتے تو چائے کے فوائد اور نقصانات پر ایک تقریر کرتے۔ چائے کے ساتھ دوسری منشیات بھی زیر بحث آ جاتیں اور بات شراب کی قسموں پر ختم ہوتی۔ غرضیکہ بن بلائے جاتے۔ بخیل حاتم بنے سوال کرتے اور خود ہی جواب دیتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ سننے والا کوئی بھی موجود نہ ہوتا اور ان کی تقریر چل رہی ہوتی۔

ہمارے بچپن کے دوست تھے۔ گھر پر عموماً آجاتے۔ ہمیں متوجہ نہ پاکر بچوں سے دل بہلاتے۔ بچوں کو ٹافیاں مل جاتیں اور وہ بے صبری سے انتظار کرتے۔ ہمارے گھریلو مسائل میں دخل دیتے۔ حل بتاتے اور جب تک ہم سے نہ منوا لیتے کہ ان ہی کی تجویز معقول تھی پیچھا نہ چھوڑتے۔ ہم اپنے مسائل کو بہت چھپاتے، مگر بچوں کو بہلا پھسلا کر کچھ نہ کچھ پتہ لے لیتے۔ ہم نے بھی اپنی عادت بدل ڈالی۔ وہ جو کچھ کہتے ہم ہاں کہہ دیتے۔ بہت خوش ہوتے کہ ان کی ہر بات مانی جاتی ہے۔

ایک روز ہم اپنے گھر میں سو کر اٹھے ہی تھے کہ حضرت تشریف لے آئے۔ کہنے لگے پچھلی رات نیند نہیں آئی شعر دماغ میں کلبلا رہے تھے۔ کاغذ قلم اٹھایا پوری آٹھ غزلیں لکھی گئیں طبیعت ایک مقالہ لکھنے پر آئی تو مقالہ لکھ ڈالا۔ دن چڑھا تو تمھاری طرف چلا آیا۔ سوچا غزلیں اب سُنا آتا ہوں۔ مقالہ شام کو سہی۔ ہم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سوچ رہے تھے اور وہ ہمارا موڈ بناتے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ اب ان کی غزلوں سے جان بچے گی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا ہمارے بڑے بھائی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سامان سے لدے کھڑے ہیں۔ ہم حیران کہ یہ تو کینیڈا میں مقیم تھے اچانک یہاں کیسے۔ ہم نے پوچھا کہ بھائی جان خبر دی ہوتی تو ہم ہوائی اڈے پر پہنچ جاتے۔ کہنے لگے میں ——— SURPRISE دینا چاہتا تھا۔ ان کی بات ہمارے دوست نے بھی سُن لی ہمارے بھائی سے اپنا تعارف خود ہی کرایا اور ان کا تعارف کتنا طویل ہوگا، اس کا اندازہ آپ کر ہی سکتے ہیں۔ تعارف ختم ہوا تو لفظ SURPRISE پر بات شروع کر دی۔ ہم نے مجبور ہو کر ٹوکا تو کہنے لگے۔ اچھا شام کو آؤں گا۔ غزلیں بھی سُناؤں گا، مقالہ بھی پڑھوں گا۔ اور مہمان کو SURPRISE بھی دوں گا۔ ہم خوش کہ وہ تشریف لے گئے۔ شام کو ان کی تشریف آوری سے پہلے ہم رفوچکر ہو جائیں گے۔

جب ہم بہت لیٹ گھوم پھر کر اور شاپنگ وغیرہ کر کے لوٹے تو دیکھا حضرت لان میں ٹہل رہے ہیں۔ کہنے لگے۔ بھائی صاحب تمھارا چلے جانا اور پھر دیر سے آنا مجھے

بہت سود مند رہا۔ کچھ قطعات تو مَیں نے یہیں کہہ دیے ہیں۔ رُباعیات دن میں لکھ
لی تھیں۔ اب آپ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جائیے تو کلام پیش کروں۔ کھانے میں
انھوں نے ہمارا ساتھ دیا۔ ہم تھکے ماندے آئے تھے اور پھر دیر بھی ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں
غنودگی چھانے لگی۔ عین اُس وقت حضرت نے اپنا پٹارہ نکالا۔ ہم تو خاموش رہے
لیکن ہمارے بڑے بھائی نے کہہ ہی دیا کہ آپ ڈرائنگ رُوم میں بیٹھئے اور خود کو ہی
سُنائیے۔ ہمیں تو نیند نے آ دبوچا ہے۔ ہم جب صبح اُٹھے تو دیکھا کہ حضرت شیشہ
سامنے رکھے غزلیں سُنا رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ جو لکھ چکے ہیں انھیں پھر سے سُنا
رہے ہیں۔ اور جو سُنا چکے ہیں انھیں پھر سے لکھ رہے ہیں۔ ہم نے اُٹھایا۔ چائے پلائی اور
وہ چلے گئے۔ بھائی صاحب نے ہم سے ان کا نام پوچھا۔ میں نے کہا نام تو ان کا یاد نہیں
لوگ انھیں "تو کون مَیں خواہ مخواہ" ہی کہتے ہیں۔ پھر ہنسی کا ایک فوّارہ چھوٹا۔

میری نظر میں ابھی تک یہ محاورہ ریسرچ کا موضوع نہیں بنا۔ علم دوست
حضرات، ریسرچ اسکالروں اور یونیورسٹیوں میں ممتحنوں کو چاہیئے کہ وہ اِدھر
توجہ دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے دوست ان کی پوری مدد کریں گے۔

عِشق

عِشق کے لغوی معنی ہیں، کسی شے کے ساتھ حد سے بڑھ کر محبت کرنا۔ جنون کے ایک قِسم کا مرض ہے، جو حسین صورت کو دیکھنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اصطلاح میں اس لفظ کے معنی سلام و داع کے ہیں۔ چنانچہ آزاد لوگ یہاں بھی بجائے سلام علیک کے عشق اللہ کہا کرتے ہیں۔

عشق صرف انسان کرتا ہے۔ لفظ انسان اُنس سے مشتق ہے۔ لہٰذا عشق محبت، پیار اس کی فطرت ہے عِشق ہوس کا شکار ہوتا ہے۔ اگر ہوس غالب آجائے تو جنسی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش دائرہ سے باہر نکل جائے تو جنون کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پھر انسان انسانیت سے گر جاتا ہے۔ اخلاقی خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نتیجہ اس کا رسوائی اور ذلالت ہوتا ہے۔ ایسا شخص اپنے گھر کو، اپنے شہر کو بلکہ اپنے

ملک کو بدنام کرتا ہے۔ اسی لیے ایک شاعر کا فرمانا ہے۔

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عشق کی دو شکلیں ہیں عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی۔ عشقِ مجازی کا آغاز حواسِ ظاہری سے ہوتا ہے۔ یعنی آنکھ، ناک، کان کے ذریعہ اور لمس سے کشش پیدا ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جسم کو بجلی کے تار نے چھو لیا ہو۔ اور پورے جسم میں کرنٹ پیدا ہو گیا ہو۔ یہی وہ کرنٹ ہے جو انسان کو انسان ہی رہنے نہیں دیتا۔ عشقِ حقیقی حواسِ باطنی، قوّتِ متخیلہ، قوّتِ حافظہ، قوّتِ عقل اور قوّتِ حِس مشترک سے پیدا ہوتا ہے۔ عشقِ حقیقی کو پانے کے لیے راستہ عشقِ مجازی سے ہی نکلتا ہے۔ چونکہ عشقِ مجازی پست درجہ کا ہوتا ہے اس لیے عشقِ حقیقی کے متلاشی ایسے پیروں، فقیروں، اور مرشدوں کا سہارا لیتے ہیں۔ جنھوں نے عشقِ مجازی کے گڑھے میں گرے بغیر عشقِ حقیقی کو پا لیا ہو۔ اس لیے صوفی لوگ عشق کو برکت کہتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ زاہد بھی عمر بھر روتے رہے اور روتے گئے۔

عشق کسی علاقہ کے لیے مخصوص نہیں۔ جگہ میدانی ہو۔ پہاڑی ہو، جنگل ہو، بیابان ہو، لق و دق صحرا ہو۔ امارت اور غربت کی کوئی تمیز نہیں۔ عُمر اور قد کی کوئی قید نہیں۔ ذات پات کا کوئی بکھیڑا نہیں۔ آب و ہوا اور موسم کا کوئی اثر عشق پر نہیں۔ مذہب، ذات، قوم، نسل، سب اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

اہلِ سائنس کا خیال ہے کہ عشق چاہنے والوں پر کسی کا اختیاری نہیں بلکہ یہ ایک جذبۂ اضطراری ہے۔ جو گزشتہ زمانے کے ہزارہا سیلانِ طبائع نے وراثتہً ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظّارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

محبت ہو جاتی ہے کی نہیں جاتی۔

تاریخ میں مجنوں کا ہم پلّہ عاشق اور کوئی نہیں۔ مجنوں کا نام قیس تھا لیکن

نے مہدی بھی لکھا ہے۔ اس بات میں سخت اختلاف ہے کہ مجنوں کا وجود واقعی ہے یا فرضی۔ متعدد روایات ہیں یہ واقعہ فرضی ہے۔ قول قوی یہی ہے کہ مجنوں اور لیلیٰ فی الواقع اس عالم میں تھے۔ نجد جو عرب کا علاقہ ہے۔ ان کا وطن تھا۔ بچپن سے دونوں اپنے اپنے گھر کے مویشی چرایا کرتے تھے۔ اسی عالم میں عشق پیدا ہوا۔ لیلیٰ کی عمر بڑھی اور اسے پردے میں بٹھا دیا گیا۔ مجنوں کی حالت غیر ہونے لگی۔ مجنوں کے والدین نے شادی کا پیغام بھیجا جو نامنظور ہوا۔ قیس کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل گیا۔ لیلیٰ کی شادی دوسری جگہ کر دی گئی۔ لیلیٰ کی بے قراری نے اس کی شوہر کی زندگی وبالِ جان کر دی۔ آخر بے تعلقی ہو گئی۔ لیلیٰ حسرت ویاس میں جان سے گئی۔ مجنوں وفات کی خبر سن کر کب زندہ رہ سکتا تھا، وہ بھی اللہ کو پیارا ہوا۔ اس قصے کو بہت سے شعراء اور ادباء نے نظم میں باندھا ہے اور نثر میں لکھا ہے۔ لیکن خسروی اور نظامی کے خمسوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ مجنوں لیلیٰ خسروی کی تیسری مثنوی ہے جو ۶۹۸ھ میں منظم ہوئی۔ نظامی کی مثنوی کا نام لیلیٰ مجنوں ہے۔ اس سے اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

وہ مضامین جو سرزمینِ عرب سے مخصوص تھے۔ فارسی اور اردو میں بہ کثرت استعمال ہونے لگے۔ چنانچہ ناقہ، محمل، ساربان، حدی، صحرا، خارِ مغیلاں، قبیلہ یہ تمام الفاظ گل و بلبل، شمع و پروانہ، دجلہ و فرات کی مثل شعراء اور ادبا کی زبانوں پر چڑھ گئے۔ اسی طرح یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا، سسّی پنوں، سوہنی مہیوال، وامق عذرا، بے نظیر، بدر منیر، سیف الملوک، بدیع المال، تاج ملوک، گل بکاؤلی وغیرہ کے تذکرے نظم و نثر میں قلمبند ہوئے۔ عشق کی داستانیں عربی، فارسی، ترکی، پشتو، اردو، سنسکرت، ہندی اور یورپ کے لٹریچر میں بھری پڑی ہیں۔ عشق کا فتویٰ ہے کہ " دد کے سوا تمام دنیا، حرفِ غلط۔"

کوئی شاعر اپنا کلام عشق، عاشقی، معشوق، عشق بیچاں کے بغیر مکمل نہیں سمجھتا۔ کوئی دیوان اس قباحت سے خالی نہیں۔

ناسخ فرماتے ہیں:

کر دیا ہے تماق ایسا عشق کے آزار نے
پیش ازیں تیار رہتے ناسخ ہمارے ہاتھ پاؤں!

آتش کا شعر دیکھیے:

جس سے لپٹا سو کھا مجنوں کی طرح سے وہ درخت
عشق نیچے پر مجھے ہوتا ہے شک زنجیر کا

اصغر گونڈوی جیسا صوفی شاعر عشق کو حسن کے ساتھ عرش تک پہنچتے دیکھتا ہے لیکن عشق کی منزل کا پتہ نہیں چلتا۔ فرماتے ہیں۔

عرش تک تو لے گیا تھا ساتھ اپنے حسن کو
پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے

جمیل مظہری نے کیا خوب کہا ہے:

عشق اک تشنہ لبی ہے بہ نظر گاہِ مجاز
حسن اک طنز ہے اس تشنہ لبی پر اے دوست

غرضیکہ عشق اک تباحت ہے لیکن اگر یہ عاشق نہ ہوتے تو عشق نہ ہوتا تو امانت کیسے کہتے:

عشق وہ گل ہے کہ دامن میں ہیں جس کے سو خار
عشق وہ نخل ہے جس میں نہ لگا پھل اک بار
عشق وہ میوہ ہے جس میں نہیں لذت زنہار
عشق وہ باغ ہے جس میں کبھی آئی نہ بہار
عشق وہ شاخ ہے جس میں نہیں پتہ دیکھا
عشق وہ غنچہ ہے جس کو نہ شگفتہ دیکھا

لیکن آج زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ عشق نے رنگ بدل لیا ہے۔ عاشقوں نے جوڑے بدل لیے ہیں۔ اب مجنوؤں کے والدین لیلاؤں کے گھروں پر پیغام نہیں بھیجتے

عشق بیچوں کے لیے کوئی وقت نہیں۔ ٹیلی فون پر عشق کا۔ مظاہرہ ہوتا ہے۔ فضائے عالم میں نکلیے۔ نظامِ کائنات اور طبایع موجودات کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ عشق کے معنی ہی بدل گئے ہیں۔ یعنی،

" تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی "

TABASSUM

WIT & HUMOUR

RAMLAL NABHVI

RS/25

رام لعل نابھوی